ہم پیار سکھانے والے ہیں

مُحبت،روشن راستہ

مُحبت دِل پہ دستک

راستے سَنور گئے ہیں

سُرخ اور سبز چُوڑیاں

تِشنگی کا سفر

وَقت اور زندگی

وہی مٹی ستارہ ہے

زندگی کی مُسکان

سمیہ عزیز آفریدی

وہ ابھی کچھ سوتے جاگتے کی کیفیت میں تھا کہ ابا نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"عجیل احمد! اٹھو! کیا آج اسکول جانے کے لیے تیار نہیں ہونا؟" عجیل احمد نے چادر سے منہ نکال کر ابا کو دیکھا اور پھر برا سا منہ بنا کر دوسری طرف کروٹ لے لی۔ طارق اور شارق قریب قریب کمرے میں لحاف اوڑھ کر لیٹے تھے اور وہ صرف ایک دری بچھائے لیٹا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ احمد کا سوتیلا بیٹا تھا یا راغب احمد کا ناخلف بچہ جسے سزا کے طور پر سردیوں میں ٹھٹھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا بس یہ بات اتنی تھی کہ اسے کچھ ٹھٹھرتے رہنے کی عادت تھی اور بقول طارق احمد کے اس کے اندر اتنا غصہ بھرا ہے کہ اسے سردی ٹھٹھرتے ہوئے بھی دس مرتبہ سوچ سکتی ہے۔

"اب کیا پسرے ہی رہو گے بستر پر۔ دیکھو تو ساڑھے سات بج رہے ہیں۔ نماز کے لیے بھی اٹھایا تھا مگر تم جیسے نافرمان بچے کو اللہ ہی نیکی کی ہدایت دے۔"

اس نے جمائی لی اور طارق اور شارق کو ایک بار پھر دیکھا دونوں کی دوسری شفٹ ہوتی تھی اور اسے صبح تیار ہونا پڑتا تھا حالانکہ پہلے وہ بھی دوسری شفٹ میں تھا لیکن پھر اچانک اس کا دماغ خراب ہو گیا اور اس نے ابا سے کہہ دیا وہ اس اسکول میں نہیں پڑھے گا جہاں طارق اور شارق پڑھتے تھے بلکہ وہ اب اپنے لیے اسکول خود منتخب کرے گا۔ یوں وہ پرائیویٹ اسکول سے نکل کر گورنمنٹ اسکول میں آ گیا۔ 8th کلاس میں تھا مگر قد کاٹھ دسویں کلاس کے بچے کی طرح تھا اور مزاج کسی ناراض نوجوان سے کم نہیں تھا۔ اماں اس کے نخرے دیکھ کر ہمیشہ یہی کہتیں۔

"پتا نہیں ہمارا عجیل کس پر چلا گیا ہے۔ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتا ہے۔ بس یہی چاہتا ہے کہ کوئی روک ٹوک نہ ہو من مانی کرتا رہے پتا نہیں کون سی غلطی کی سزا ہے۔"

وہ سنتا مگر ہنس کر اپنے کام میں لگا رہتا اسے لگتا اردگرد جو بھی گفتگو ہو رہی ہے وہ صرف اس کا مورال

تھی کہ آنکھ کھلتے ہی ابا
بڑھانے کے لیے بے کلی وجہ تھی کہ کوئی ہلچل نہیں تھی اس
کے جملوں سے اس کے اندر کوئی ہلچل نہیں تھی اس
نے چادر اتار کر پھینکی اور واش روم کی راہ لی پھر پندرہ
منٹ بعد یونیفارم پہن کر اماں کے سامنے بیٹھ گیا جو
بیٹا اماں نے اس کے لیے تازہ پراٹھا توے سے اتارا تھا
مگر وہ عجلت ہی کیا جو مختلف تکرار کی نہ دکھائے سو
نعمت خانے سے اس نے چھوٹا شاپر نکالا اماں نے غور
سے دیکھا وہ شاپر میں سے چاپ نکال کر پلیٹ میں رکھ
رہا تھا۔

"چائے دیں اماں آج پراٹھے کا موڈ نہیں ہے میرا"
اماں نے کپ میں چائے ڈال کر اس کے آگے کی
وہ چائے میں چاپ ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا جب اس نے سر
اٹھائے بغیر کہا۔

"کل جو سبزی منگوائی تھی تب نے اس میں سے
پانچ روپے بچے تھے ابا نے مجھے دے دیے تھے اس
سے لیے ہیں آپ پریشان ہو رہی ہوں گی نا"
اماں نے گہرا سانس کھینچا "یہ لڑکا بیٹیوں کی الجھن بھی
پڑھ لیتا ہے" انہوں نے سوچا اور اس نے چائے پی
کر کپ ان کی طرف سرکا کر چلتے چلتے اماں کو دیکھ کر
کہا۔

"جا رہا ہوں مگر اتنا نہیں کہ چوری کر کے آتا ہوں آپ
میرے بارے میں زیادہ مت سوچا کریں" اٹھ کر
بیگ کندھے پر ڈالا سنک میں ہاتھ دھوئے اور گھر
سے باہر نکل گیا اماں اس کی پشت دیکھتی رہیں گھر کی
سیڑھیاں اترا ہی تھا کہ گلی کے اور بچے جو اس کے
اسکول میں پڑھتے تھے اس کے ساتھ ہو لیے

"سرمایہ کا ہوم ورک مکمل کر لیا ہے یار" چلتے
چلتے اس سے بات کر لینے کی حد تک بے تکلف
دوست رضا نے سوال کیا اور وہ جو کچھ گنگنا رہا تھا رک کر اسے دیکھنے لگا ایسے جیسے اس نے
رضا کی بات سنی ہی نہ ہو رضا نے آنکھوں کا سوال
پڑھ کر پھر سے سوال دہرایا۔

"سرمایہ کا ہوم ورک مکمل کر لیا ہے یار" اس
نے ہولے سے کہا۔

"یار والی بات درست ہے" رضا نے بازو پکڑ لیا۔
"تمہیں پتا ہے آج جو ہوم ورک مکمل کر کے
نہیں لائے گا اسے ہتھیلیوں پر پانچ پانچ اسٹک اور
کلاس روم سے باہر کھڑا کرنے والے ہیں سرمایہ"
اس نے کندھے اچکائے جیسے اس کی بلا سے سرمایہ
کوئی بھی رویہ اختیار کریں اس سے اسے کوئی فرق
نہیں پڑنے والا۔

"آخر تم نے ہوم ورک مکمل کیوں نہیں کیا؟"
اگلا سوال تجسس کے زیر اثر کیا گیا تھا۔ اس نے گھوم کر
رضا کو دیکھا پھر اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی بس گھر کے چھوٹے
موٹے کام کرنے میں وقت نکل گیا پھر میرا کچھ اپنا بھی
موڈ نہیں تھا میں ہوم ورک کر لیتا تو اس میں کیا خاص
بات ہوتی۔"

"نہ کرنے میں کیا خاص بات ہے؟" رضا نے
ترت سوال کیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔

"سیدھی سی بات ہے نہ کرنے میں بھی کوئی خاص
بات نہیں تھی بس سرمایہ جس طرح بی ہیو کرتے ہیں
اس سے مجھے ضد ہو جاتی ہے کوئی مجھے کسی کام کو کرنے
پر اصرار کرتا ہے تو میرا دماغ اس کام کو نہ کرنے کی قسم
کھا لیتا ہے مجھے ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کی عادت
ہے۔" رضا نے اچنبھے سے دیکھا اس طرح کی بات کی
اسی سے توقع کی جا سکتی تھی۔

اب اس نے سر جھکا کر چلنا شروع کر دیا تھا اور وہ
اس کی طرف سے غافل ہو کر راستہ طے کرتا رہا۔
اسکول سامنے آیا تو وہ یکدم رک گیا۔

"آج اسکول سے چھٹی نہ کر لیں۔" ایک نیا آئیڈیا
پیش ہوا اور یہ آئیڈیا عجلت ہی دے سکتا تھا رضا کے
اٹھتے قدم رک گئے تھے۔

"چوکیدار ہمیں دیکھ چکا ہے۔ اب اگر ہم اسکول
نہیں جائیں گے تو سیدھی شکایت کر دے گا۔"

"سو واٹ میرا ساتھ دے رہے ہو یا نہیں۔۔۔"
اس نے بیگ دائیں کندھے سے بائیں کندھے پر
منتقل کیا۔

ہوتے مگر معاملہ بگڑا تو تم ہی سنبھالنا۔"
"کوئی شرط نہیں ہے اور ستو ودستی شرطوں پر ہوتی ہے۔" اس نے زیر بار ہونے کی بجائے زیر کیا۔ رضا گندھے اچکاتے ہوئے بولا۔
"نہیں کیا بات ہے تمہاری روز فرزند شب۔ دل نہیں کرتا ہوگے ہر طرح کے معاملے کا خود ہوں گا اب بتاؤ کیسے اسکول سے نکلیں۔"
اس نے سوال کیا اور وہ چلتے چلتے پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ رضا اس طرح اسے زمین پر گھٹنے ٹیکتے دیکھ کر گھبرا گیا۔
"یار! کیا ہو گیا تمہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ٹھیک تھے۔"
"میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔" اس نے کیفیت میں کہا۔ چوکیدار جو انہیں دیکھ رہا تھا تیزی سے ان کی طرف آیا۔
"کیا ہوا ہے اس لمڈے کو۔" اس نے رضا سے پوچھا۔ منمنانے کا بات کا لب لباب یہ تھا کہ اس کا اچانک پیٹ کے درد کی وجہ سے بے حال ہو گیا۔ چوکیدار نے کچھ سوچا اور گھر جانے کا این او سی دیا۔ وہ دونوں تیزی سے اٹھے مگر عجیل احمد نے ابھی تک پیٹ پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں دل میں اپنے خیال کی تیز گامی کو سراہتے آگے بڑھ گئے۔ اسکول پیچھے رہ گیا تب رضا نے بول کر کہا۔
"ہم کیا کریں گے اتنی دیر تک۔"
"وہی کریں گے تم جو کرنا چاہو کرو تمہیں معلوم ہے پیٹ لیے پھرنا قطعاً" اچھا نہیں لگتا۔" ایک جگہ رضا چلتے چلتے رک گیا۔
دوستی کے قسمیں وعدے ہو رہے تھے اور جلا ہونے کا اعزاز یہ اعزاز بہت بھاری ہے۔ بچو ہونا۔ عجیل نے یوں دیکھا جیسے اسے اس فرق نہیں پڑنے والا کہ اس کے کسی جملے کا فوری فلاباشی ہو کر واپس آتا ہے۔ وہ دونوں الگ تھے رضا چونکہ گھر نہیں جا سکتا تھا اس

لیے وہ کھیلنے چلا گیا۔ کل ہی اس نے ابا سے جھوٹ موٹ کی پتنگ کا کہہ کر روپے اینٹھے تھے۔ عجیل فارغ تھا اس لیے اس کا رخ شفو باجی کے گھر کی طرف ہو گیا۔
شفو باجی ان کے ابا کی خالہ کی بیٹی تھیں اور یہاں بیاہ کر آئی تھیں۔ باقی گھر والوں سے الگ ذرا ہٹ کر اسے زیت کرتی تھیں اسی لیے اس کا جب موڈ ہوتا۔ وہ اسکول اور ٹیوشن سے چھٹی کر کے یہاں چلا آتا۔ شفو باجی کے شوہر دبئی میں ڈرائیور تھے ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو ابھی تین سال کا تھا اس نے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی۔
"کون ہے؟" ایک تیز گھراتی آواز گونجی۔ یہ شفو باجی کی آواز تو نہیں تھی کھٹاک کی آواز سے دروازہ کھلا۔
"کون۔"
"وہ جی میں عجی ہوں۔" عجی نے تمہید باندھی اور وہ بوڑھی خاتون جو دن رات اپنی گلی میں کھیلی جانے والی کرکٹ سے تنگ تھیں اسے اسی کرکٹ کا کوئی نمائندہ سمجھ کر بول پڑیں۔
"اے میں کہے دیتی ہوں گیند وید نہیں دینے کی میں اگر گیند چھت پر بھی آئی ہے تو اس کو حسن دینے کی بجائے چھری سے اس کے دو ٹکڑے کردوں گی۔ اے واوند دن دیکھو نہ رات نہ بارش دیکھو نہ بیماری بس دروازہ بجاتے جاؤ سارے جو کے سارے چھکے ہمارے دروازوں کی قسمت میں لکھے رہتے ہیں۔"
عجیل احمد صم بکم کھڑا رہا خیر ہوئی سفیر رزاق عجی بھائی عجی کرتا ہوا اس سے آ کر لپٹ گیا۔
"کون عجی۔ مجھے شفو نے کسی عجی کے آنے کا نہیں کہا تھا اے میاں جو کوئی ہو اپنے گھر کی راہ لو۔"
"شفو باجی گھر پر نہیں ہیں کیا۔"
"مما مارکیٹ گئی ہیں عجی بھائی۔" بچے نے معلومات دیں اور وہ خاتون اسے گھورنے لگیں۔
"سفیر بچے' ہر ایرے غیرے کو اپنی زندگی کے

"معمولات نہیں بتایا کرتے۔" انہوں نے بچے کو پکارا
پھر اس کو دیکھ کر سختی سے بولیں۔
"بس میاں بہت ہو گئی اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ
—" اس نے سر ہلا کر دروازے پر رکھا اپنا ہاتھ ہٹا دیا۔
"پہچان کس قدر ضروری ہے۔" یہی وہ لمحہ تھا جو
اس کے اندر کی ہونے والی مزاج کی تبدیلی کو یک دم
عدم سے وجود میں لے آیا۔ اس کے الگ اور ہٹ کر
کیے جانے والے سارے کام اس پہچان کی خواہش ہی
سے تو تحریک پذیر ہوتے تھے۔
اہمیت اختیار کرنا خود کی ایک مضبوط وجہ بننا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اس دن شفو باجی کے گھر سے قدم
موڑے تو سیدھا گھر آ کر نکا۔ اماں اتنی جلدی آنے پر
ہراساں ہو گئی تھیں۔
"طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" اس نے بیگ
سائڈ ٹیبل پر رکھا اور صاف گھر کو دیکھ کر مٹی میں
لتھڑے جاگرز اتارے اور گرد مٹی بکھری ہوئی دیکھ کر
اس کے اندر عجیب طرح کی سوچ نے دستک دی مگر
ابھی وہ اس سوچ کو طول نہیں دے سکا تھا وہ اماں کو
خاموشی سے مٹی اٹھا کر ڈالتے دیکھتا رہا اماں مٹی ڈسٹ بن
میں ڈال آئیں تب تک وہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا مگر اس کی ماں
نے اس کا کچھ حصہ ڈسٹ بن کی نذر کر دیا ہے اماں واش
بیسن میں ہاتھ دھو کر تولیے سے ہاتھ پونچھتی اس کے قریب
پھر سے آ گئیں۔
"کیا ہوا کیا طبیعت خراب تھی؟"
اس نے ٹائی اتار کر ٹیبل پر دھری، پھر سچائی سے
بولا۔
"اونہوں، اسکول جانے کو دل نہیں کر رہا تھا اس لیے
چھٹی کر لی جھوٹ بول کر گھر آ گیا۔"
وہ غلطی کو کبھی چھپاتا نہیں تھا ہمیشہ سچ بولتا تھا اماں
اس کی اس دوہری شخصیت پر حیران رہتی تھیں، کبھی
اس سے زیادہ نرم دل کوئی نہ ہوتا، کبھی اس سے زیادہ
بے حس کوئی اور دکھائی نہ دیتا۔ بہت الگ تھلگ تھا
ان کا یہ بچہ۔
اماں نے عجیل احمد کو دیکھا اور اماں دوسری کرسی
پر آن بیٹھیں پھر دوستانہ لہجے میں بولیں۔
"آج تمہارا دل اسکول جانے کو نہیں کر رہا تھا اور ابا
نے زبردستی اسکول بھیجا تھا نا؟" عجیل احمد نے چونک
کر سر اٹھا کر اماں کو دیکھا یہ اماں کب سے اس کے دل
کی بات جاننے لگیں۔ وہ یکدم کنفیوژ ہو گیا بہرحال
وہ کسی پر آشکار ہونے کا موڈ نہیں رکھتا تھا۔ بظاہر تھوڑ
سیل کا تھا مگر سوچیں تو بڑے دماغ کی تھیں۔ یہی وجہ
تھی کہ اپنی عمر کے کھیل، شرارتیں اور باتیں اس سے
ہضم نہیں ہوتی تھیں اور ابا کہتے وہ حد درجہ ڈھیٹ بچہ
ہے اور نافرمانی نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا
دیے۔ اماں پر اس کی نظر اب بھی ٹکی ہوئی تھی۔ وہ
کتنی دیر اماں کو دیکھتا رہا پھر ہولے سے بولا۔
"مجھے لگتا ہے میں آپ کا سب سے برا بیٹا ہوں۔"
اماں نے لہجے میں عجیب احساس پایا تو کھینچ کر سینے سے
لگا لیا پھر سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولیں۔
"پاگل ہوا ہے میرا بیٹا برا کیسے ہو سکتا ہے مجھے تو لگتا
ہے میرا یہ والا بیٹا سب سے اچھا والا بیٹا ہے، بس کچھ
جھلا ہے نہ اپنی سمجھ ہے تجھے، نہ اپنے دل کی اور اپنے
آپ سے بھاگا پھرتا ہے اتنا سا ہے پر اندر سے لگتا ہے
بہت بڑا ہو گیا ہے۔" اماں نے ان پڑھ ہو کر بھی اس کا
بالکل ٹھیک تجزیہ کیا تھا اسے حیرت ہوئی تھی اس کی ٹیچر
تو کہتی تھیں اعلا تعلیم ہی انسان کو سمجھ بوجھ عقل دیتی
ہے شاید انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا اعلا تعلیم انسان کو
سمجھ بوجھ عقل تو دیتی ہے مگر اس کو کس طرح استعمال
کرنا چاہیے یہ زیرک فہمی صرف ایک ماں جان سکتی
ہے یا اللہ دے سکتا۔ اس کی ماں ان پڑھ ضرور تھی مگر
جاہل نہیں تھی اور اعلا تعلیم پانے والے بس اس
نازک نکتے کو نہیں سمجھ پاتے اور سامنے والے کو رد کر
دیتے ہیں، حالانکہ انسان خود کو رد کر دیتا ہے تب
دوسرے کو سمجھنے کی پہلی سیڑھی چڑھتا ہے۔
"اماں۔" اس نے سوچتے ہوئے اماں کو پکارا اماں
جو اس کے سر میں انگلیاں پھنسائے اس کا سر سہلا رہی

میں فوراً ہی بولیں۔

"جی میرے بچے کیا کہنا ہے۔"

"آپ نے ایک بار کہا تھا آپ کو میری ذات مزاج کی لگتی ہے آپ نے ایسا کیوں کہا تھا۔"

اماں تو یہ سب کہہ کر بھول بھی گئی تھیں۔ یکدم گھبرا گئیں سیدھی سی بات تھی کم تنخواہ میں پانچ بچے ان کی تعلیم اچھا کھلانے پڑھانے کی ذمہ داری اکیلی جان پر ہو تو کبھی کبھی منہ سے سخت بات نکل جاتی ہے انسان ایک جیسے حالات سے اوب کر اپنے غصے کو کسی اور پر نکالنا چاہتا ہے پھر غصے میں یاد رہتا ہے کون سا لفظ کس طرح جڑا کسی لفظ کے ساتھ مل کر مزید سخت ہو گیا اور اس وقت عجیل ایسے کسی جملے کی بابت پوچھ رہا تھا انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا لیکن کچھ کہنا تو ضروری تھا سو گلا کھنکھار کر انہوں نے کہا۔

"وہ تو غصے میں نکل گئے تھے بیٹا اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

عجیل احمد نے اماں کے سینے سے سر ہٹا کر اماں کو دیکھا انہیں گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر بولا۔

"مگر اماں میری ٹیچر تو کہتی ہیں انسان صرف دو حالتوں میں لازمی سچ بولتا ہے ایک مرتے وقت دوسرا غصے کی حالت میں۔"

اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا اب معاملہ ان کی دسترس سے باہر ہو گیا تھا مگر بہرحال وہ ابھی تک سوال بنا انہیں دیکھ رہا تھا انہیں کچھ اور کہنا ضروری تھا۔

"عجیل بیٹا تمہارا سب سے الگ رویہ مجھے کبھی کبھی بہت ہولاتا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم بھٹک نہ جاؤ اسی لیے اس دن غصے میں وہ لفظ نکل گیا تھا مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہاری خراب تربیت کا سارا الزام مجھ پر نہ آ جائے تم تو جانتے ہو میں اپنے تینوں بیٹوں اور دونوں بچیوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھتی وہ سب اپنی اماں کے ابا کے فرمانبردار ہیں مگر تو اپنی من مانی کرتا ہے تجھ کو ذرا سا لگتا ہے۔"

"تمہارا ابھی کہنے سے آپ کو یہ کیسے لگا میں نافرمان

ہوں یا جیتو ہوں کیا میں نے کبھی آپ سے کسی بھی بات کے لیے جھوٹ بولا؟" اماں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے کہنا پڑتا ہے تو نے کبھی میرے سامنے اپنی کسی غلطی پر بھی جھوٹ نہیں بولا مجھے اس کے لیے کسی بھی طرح کی سزا ہی کیوں نہ دی گئی ہو۔"

"حالانکہ میری ٹیچر کہتی ہیں سچ بولنے پر بھی بچے کو سزا نہیں دینا چاہیے ورنہ وہ پھر ساری زندگی جھوٹ بولتا رہتا ہے۔"

اماں نے عجیل احمد کو نہایت فکر مندی سے دیکھا۔

"یہ تیری کون سی نئی ٹیچر ہے جو ایسی بڑی بڑی باتیں بتا کر ابھی سے تیرا دماغ خراب کر رہی ہے۔"

عجیل احمد نے اماں کو دیکھا پھر رسان سے بولا۔

"ہمیں اچھی باتیں کہنے والوں کو برا نہیں کہنا چاہیے اماں یہ نعمت ہوتا ہے ہر اچھی بات انسان کے لیے انعام ہے اگر وہ سیکھ لے۔"

اماں نے کچھ نہیں کہا مگر کچن میں دوسرا کا کھانا بناتے ہوئے ان کا دماغ مسلسل اس کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا یہ سچ تھا وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ عجیل احمد کی ساری ٹیچرز سے ملی ہوئی تھیں اور وہ ساری ٹیچر عموماً گورنمنٹ اسکولز کی ٹیچرز کی طرح مارے باندھے پڑھانے پر یقین رکھتی تھیں اسی لیے انہوں نے اس کی ذہانت دیکھ کر گھر آکر خوب ہنگامہ کیا تھا کہ عجیل کا اسکول بالکل اچھا نہیں ہے اسے کسی اور اسکول میں ڈالنے کی ضرورت ہے اگر اس کا رزلٹ اچھا دیکھنا ہے یا پھر بنتے ہوئے دیکھنے کی خواہش ہے۔ ابا، طارق، شارق، صبیحہ اور شازیہ نے بھی اماں کی حمایت کی تھی مگر اس نے ضد کر لی تھی۔

"مجھے اسی اسکول میں پڑھنا ہے پڑھنے کی دھن رکھنے والے کسی بھی جگہ سے پڑھیں کچھ بن کر ہی نکلتے ہیں۔" سو اس کی ضد کے آگے سب کو ہار ماننی پڑی تھی کیونکہ اس نے ماں باپ سے ہٹ کر بھی اپنی ضد برقرار رکھی تھی بلکہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ اگر اس اسکول سے نکالا گیا تو وہ کسی ورکشاپ میں نوکری کرے گا پڑھے گا نہیں اسی لیے ابا کو ہار ماننی پڑی تھی اب اماں کو لگن لگ گئی تھی سو وہ اس کی اتنی ذہین ٹیچر کا کھوج لگا لیں جو ان کے اتنے سے بچے پر اپنی علمیت کا بھوت چڑھا رہی ہے وقت سے پہلے کی ذہانت بھی انسان کو کند کر دیتی ہے جب اس کی باتوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا انسان نہ ملے تو انسان اپنی موت آپ مر جاتا ہے یا مایوسی کے اندھیروں میں گم ہو جاتا ہے کچھ کر گزرنے کے لیے ضروری ہے ارد گرد آپ کی بات سننے اور سن کر سمجھنے والے لوگوں کی قربت ہو۔

☆ ☆ ☆

اماں بھلے پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر زیرک بلا کی تھیں اس لیے دوسرے دن ہی وہ اس کے بریک سے پہلے اس کے اسکول پہنچ گئی تھیں پرنسپل سے اس کی پروگریس لینے کے بہانے انہوں نے کسی نئی ٹیچر کے بارے میں بھی پوچھا خود بھی ٹیچرز کو دیکھا کوئی نیا چہرہ نظر نہیں آیا۔

"یہ سوال غیر ضروری سہی لیکن کیا میں جان سکتی ہوں آپ نے 8th کلاس کے لیے کوئی نئی ٹیچر رکھی ہے دراصل میرا بیٹا اپنی ٹیچر کی علمی قابلیت کے اتنے قصے سناتا رہتا ہے کہ میرا دل بے ساختہ اس کی ٹیچر سے ملنے کو چاہنے لگا اور میں گھر کی مصروفیت چھوڑ کر اسکول آگئی آپ تو جانتی ہیں ہم گھریلو خواتین کی ذمہ داریاں۔"

پرنسپل مسکرا کر اس دیکھتے ہوئے موضوع سے قطع نظر کہ گھریلو عورتیں زیادہ کام کرتی ہیں یا باہر کام کرنے والی خواتین زیادہ محنت کرتی ہیں یک دم اصل موضوع پر آگئیں ذہن میں ٹیچر کی لسٹ دہرائی پھر مسکرا کر بولیں۔

"میرے علم میں ایسی کوئی ٹیچر نہیں ہے جو بقول آپ کے بے حد قابل ہو آپ کو تو پتا ہے ہمارے ہاں کا ٹیچر آج کل یہاں جس کو کوئی نوکری نہیں ملتی وہ ٹیچنگ لائن میں آجاتا ہے۔ میں یہ ان ٹیچرز کے متعلق نہیں کہہ رہی جو تعلیم کو خون جگر دے کر آج

...نچے کے عملی مظاہرے میں اپنی محنت صرف کر
...ہے ہیں۔ میں یہ صرف ان افراد کے لیے کہہ رہی
...جن کی مقدار آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی
...ر کرتی ہے اس لیے قوم کا کوئی مستقبل نظر نہیں

...لاڑ۔"
...نسپل صاحبہ بلا کی باتونی تھیں اور شاید کسی زمانے
...بھی رہ چکی تھیں' اماں چونکہ ٹی وی کے ٹاک
...ابی ہی دھواں دھار تقریریں ہوتے دیکھ چکی
...اس لیے فوراً" اندازہ لگایا اور اجازت لیتی ہوئی
...تھیں۔ مگر برا ہو بریک کا جو اچانک ہی ہو گئی تھی
...اماں نے چہرہ نقاب سے چھپا رکھا تھا مگر بیٹے کی تیز
...ے ہراساں تھیں کہیں دیکھ لیا اس نے تو پھر
...عجب طرح کے سوال اٹھانے لگے گا وہ تیز قدموں
...چلتی ہوئی پرنسپل کے روم سے سیڑھیاں اترتی
...نے کے پارک کو طے کرتی گیٹ تک پہنچنے ہی والی
...کہ اچانک کسی نے ان کے برقعے کو کھینچ لیا۔
"اماں۔ اماں یہ آپ ہیں نا۔"
...ماں کو ہامی بھرتے ہی بنی اس نے اقرار سنا تو فوراً"
...لہجے میں بولا۔
"بری بات اماں آپ اسکول آئی تھیں تو مجھ سے
...بغیر کیوں جا رہی تھیں۔"
"مجھ سے اماں گھر میں مل لیتی ہیں کافی نہیں
...۔" اماں کی جگہ رضا نے جواب دیا تو اماں کے
...نٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
"یہ تمہارا دوست ہے۔" اماں نے پہلی بار کسی
...اس سے اتنی بے تکلفی کرتے اور اتنی بے تکلفی
...اس پر رعب و دبدبہ ڈالتے سنا تھا انہیں اچھا لگا تھا۔
"تم نے بتایا نہیں یہ تمہارا دوست ہے۔"
...عجیل احمد نے اماں کے پاس بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ وہ
...پل کے روم کے باہر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے
...عجیل احمد نے سانس لی گھری سی بھاگ دوڑ سے جو
...اس کا دوران تیز ہو گیا تھا اسے نارمل کیا پھر آہستگی سے
...۔
"پتا نہیں اماں یہ میرا دوست ہے یا نہیں لیکن کبھی

بھی اس کی باتیں اتنی اچھی لگتی ہیں اسے دوست
کہنے کو دل چاہتا ہے حالانکہ میری ٹیچر کہتی ہیں ایک
اچھے دوست کی تلاش ہے تو انسان کو کوئی اچھی کتاب
پڑھنی چاہیے اچھی کتاب آپ کو کسی بھی طرح کا نیا
علم بغیر آپ پر احسان جتائے آپ کے اندر انڈیل دیتی
ہے اور اگر ہم اس کتاب کو کہیں رکھ دیں تو وہ انسانوں
کی طرح آپ کی کسی کی پرجیسی نہیں ہے نہ پیٹھ پیچھے
آپ کی برائی کرتی ہے۔ آپ جتنی مرتبہ اس کتاب کو
اٹھائیں وہ آپ کو اتنی ہی مرتبہ خوشی سے ویلکم کرتی
ہے۔"
"لیکن بار بار ایک کتاب پڑھنے سے اس کا
تجسس والا چارم تو ختم ہو جاتا ہے نا آپ پہلے سے
جانتے ہیں آپ کیا پڑھنے جا رہے ہیں۔" رضا نے
اسی کی طرح کی مشکل بات کی اماں کو ان کی دوستی کی
نہج پتا چل گئی ان کی نظریں عجیل احمد پر اٹکی ہوئی
تھیں اور عجیل احمد نے کچھ سوچ کر کہا تھا۔
"کسی چیز کا چارم ختم ہوتا ہے تو وہ خامی اس چیز میں
نہیں ہوتی ہمارے اندر ہوتی ہے کیونکہ جو چیز ہمیں
اچھی لگتی ہے یہ اس کا حق ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح
اچھی لگے۔"
"اتنی بڑی بڑی باتیں مجھے خوف آنے لگا ہے تیری
باتوں سے کس پر چلا گیا ہے عجی۔" اماں نے فکرمندی
سے دیکھا۔ اس نے کندھے اچکائے پر ماں کا دل تھا' ابا
سے اسی رات کہنے لگیں۔
"مجھے لگتا ہے اپنے عجی پر کسی بہت عالم قسم کی
روح نے قبضہ کر لیا ہے' ورنہ ہمارے باقی بچے بھی تو
ہیں انہوں نے ایسی مشکل باتیں کبھی نہیں
کیں۔ اس کی باتیں سنو تو لگتا ہے کوئی پوری عمر کا پکا
مرد بول رہا ہے اتنی گہری نظر اتنی بڑی بڑی باتیں —
میں کہے دیتی ہوں اس بچے کو کسی پیر سیانے کو دکھاؤ'
ورنہ میرا بچہ کہیں حق ہو کہتا گھر سے باہر نہ نکل
جائے۔" ابا نے اماں کی فکرمندی کو نہایت خلوص
سے جوابا" فکرمندی سے لیا پھر یکدم انہیں اس کی
نافرمانیاں یاد آ گئیں اور وہ ترش کر بولے۔

"ٹھیک کہتی ہو تم کسی صوفی درویش کا بھٹکا ہوا گا تم نے پڑھا اسے پسند نہیں ہے اللہ کی طرف راغب کرتے کرتے تو اب مجھے خود شرمندگی ہونے لگی ہے کہ بار بار اصرار اور بار بار انکار۔ حتی بار کہا اللہ تعالیٰ ایسے بے عملوں سے سخت نفا رہتے ہیں کہتا ہے، رہنے دو ابا مجھے معلوم ہے اللہ تعالیٰ کتنی محبت کرتا ہے اپنے بندوں سے مجھے نہیں لگتا اس نے مجھے آپ کی طرح کبھی خفگی سے دیکھا ہو گا۔" تو بھلا اس نے تو اللہ کو بھی اپنا دوست بنا لیا کمال ہے بیگم یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہ آیا واقعی اسے کسی پیر کسی سیانے کو دکھانا ہی پڑے گا۔"

ابا نے اماں کے خیال پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی اور ایک پیر کے پاس لے گئے انہوں نے عجیل احمد سے سوالات شروع کیے عجیل تھوڑی دیر میں ان کے بارے میں جان گیا تھا اسے وہ لطیفہ یاد آ گیا جس میں ایک جعلی پیر کو اس کا معتقد کہتا ہے اگر آپ سچے ہیں تو اس درخت کو کہیے وہ آپ کے پاس چل کر آئے جعلی پیر نے ہانک لگائی۔

"حاضر ہو۔" بہت دیر تک رزلٹ نہیں نکلا تو اپنے چیلوں کے ساتھ وہ اٹھ کر خود درخت کے پاس چلا گیا اور مسکرا کر بولا۔

"درخت چل کر نہیں آ سکتا ہم تو چل کر اس تک جا سکتے ہیں آپ تو جانتے ہیں ہماری فیلڈ میں غرور زہر قاتل ہے۔"

اور یہی لوا یمان پر قرار تھی۔ عجیل احمد نے ابا کو لاکھ کہانیاں مارتیں لاکھ سمجھایا مگر ابا ایک نہ مانے اپنی حق حلال کی کمائی کے پانچ سو روپے ان پیر کی صدقہ پیٹی میں ڈال کر سات دن کے فلیتے جلانے کے لیے لے آئے عجیل احمد نے پیر صاحب کو خفگی سے دیکھا تو تڑ سے بولے۔

"دیکھو احمد حسن! یہ بہت بھاری جن ہے اسے اتارنے کے لیے تمہیں یہاں مستقل حاضری دینی پڑے گی۔" ابا نے اثبات میں سر ہلایا وہ گھر آئے تو اس نے خوب ہنگامہ کیا۔

"الگ بولنا الگ سوچنا الگ رہنا ضروری نہیں کہ یہ سب علامات جن کی وجہ سے ہوں ابا میں ذرا ہٹ کر جینا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں میں ایسا انسان بنوں کہ وہ اپنے بچوں پر اٹھتے بیٹھتے ذمہ داری کا بوجھ کم کم کر انہیں اپنی بات نہ کرے مجھے اماں کی محبت اچھی لگتی ہے مگر جب یہ کوسنوں طعنوں پر اتر آتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے میں اس گھر سے نکل جاؤں کبھی کبھی جو آپ دونوں لڑنے لگتے ہو تو مجھے یہ بھی برا لگتا ہے۔"

"دیکھو کیسے زبان فرانے بھر رہی ہے۔ میں کہے دیتی ہوں یہ بہت سخت اثر ہے۔" اماں نے پھر بھی نہ سنا اپنی بات پر جمی رہیں تو اس نے صبیحہ پھپھو سے امداد چاہی۔

"مجھے ان جھمیلوں میں مت کھینچیے آپ جانتی ہیں پھپھو میرا رزلٹ ہمیشہ سب سے اچھا آتا ہے۔"

صبیحہ پھپھو جو پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں رک کر اسے دیکھنے لگیں پھر بولی نہیں اور وہ بلا کا ذہین فوراً منمنانے لگا۔

"آپ اس طرح مجھے دیکھ کر یہ تو نہیں کہنا چاہتیں کہ میں جس اسکول میں پڑھ رہا ہوں وہاں گریڈ 'اے' ٹاپ کرنا کوئی مقابلے کی بات نہیں کیونکہ اس کے تعلیمی معیار سے آپ مشکوک ہیں۔" صبیحہ پھپھو دھڑ سے پلنگ پر بیٹھ گئیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے بولیں۔

"اماں کو ٹھیک لگتا ہے بھئی تم تو اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرنے لگے ہو آٹھویں کلاس کے بچے کے پاس اتنا ذخیرہ الفاظ تو نہیں ہوتا جس طرح تم پٹر پٹر بولتے ہو اور بولتے ہو تو الگ بات ہے تم تو آنکھ کا اشارہ دل میں چلتی بات بھی پک کر لیتے ہو یہ امیزنگ ہے تمہاری عمر کے بچے۔۔۔"

"پلیز پھپھو یہ میری عمر کے بچوں کا ٹاپک بند کر دیجیے آپ کو تو خوش ہونا چاہیے میں اتنا ذہین بچہ ہوں کہ مجھے خود سے کچھ سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی میں اپنا اچھا برا جانتا ہوں رہی دل کی بات جاننا تو آپ کے اندر یہ صفت [illegible] ہوئی ہے بس آنکھیں پڑھنا آنی چاہئیں۔"

صبیحہ بجو صبح بجر اسے دیکھے گئیں۔ مدد تو کیا خاک
کرتیں الٹا جاکر اماں کے کیمپ میں شامل ہو گئیں۔
ذہن کا اثر ہو یا نہ ہو مگر یہ طے ہے کہ عجیبی
نہیں کرتا اس کی عمر کے بچے انہیں تو کھیل
کی فرصت نہیں ملا کرتی۔ ایک کھیل کے ختم
ہوتے ہی دوسرا کھیلنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کی زندگی
میں پڑھائی کا اسٹیپ آتا ہی نہیں ہے۔ اماں کچھ
بیں

اماں سیکنڈ ایئر میں پڑھنے والی اپنی ڈیبیٹر بیٹی کو دیکھ کر
شرمندی سے سر جھکا گئیں۔ کچھ کرتی تو کیا۔ بس وہ جو
ذرا بات ادھر ادھر جاتا تھا اماں نے اس پر بھی پابندی
لگائی

"گھر میں بیٹھو پتا نہیں کیسے کیسے دوست بنا رکھے
ہیں جو وقت سے پہلے ہی تمہیں بڑی بڑی باتیں کرنا
سکھا رہے ہیں مجھے ہر وقت لگتا ہے تم کہیں بگڑ نہ جاؤ
"

عجیل احمد کیا کہتا ماں کے اس خیال پر ہنسنے کے سوا
اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہاں یہ ضرور تھا کہ
اب اس کے گھر کے اسٹور روم میں کتابوں کا ذخیرہ
بڑھتا جا رہا تھا اماں ہر طرح کی غیر نصابی کتابوں کے
سخت خلاف تھیں ان کا خیال تھا تعلیمی دور میں —
بچوں کو اپنے کورس کی کتابوں کے سوا کسی اور کتاب کو
ہاتھ نہیں لگانا چاہیے اماں اس بات کو ماننے کو تیار ہی
نہیں تھیں کہ کتاب کسی بھی طرح انسان کی زندگی میں
کوئی تبدیلی لا سکتی ہے' ایسے ہر موقعے پر وہ ابا کی مثال
سامنے رکھ دیتیں جو بی اے پاس تھے مگر آج تک ایک
جنرل اسٹور کی بنی بندھی کمائی سے زیادہ آگے تک کی
کسی نوعیت کی کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے' خود ابا
بھی کتابوں میں صرف فکشن بکس کے علاوہ کچھ پڑھنے
کے حق میں نہیں تھے ایسے میں اس کی گفتگو سب کے
لیے اچنبھے سے کم نہیں تھی۔
ایک صبیحہ بجو تھیں جو سیکنڈ ایئر میں تھیں ایک
اچھی ڈیبیٹر تھیں مگر اس ساری کامیابی کا سہرا ان کی
ایک ایسی دوست کے سر جاتا تھا جو انھیں الفاظ تو رٹا دیتی
تھی دلائل کی بھی جس کے پاس کمی نہیں تھی مگر بولنے
کا وقت آتا تو اس کا حلق خشک ہو جاتا ٹانگیں کانپنے
لگتیں اور سارے دلائل بھک سے اڑ جاتے یہی وجہ
تھی وہ پس پردہ رہ کر صبیحہ پر محنت صرف کرتی جب
صبیحہ کوئی ڈبیٹ جیت کر اسٹیج پر تالیوں کے شور میں
کھڑی ہوتی تو وہ سمجھتی اس نے معرکہ سر کیا اس کی
بات دور تک گئی ہے اس کے خیالات کو سراہا گیا ہے یہ
اور بات ہے صبیحہ بجو کی باتوں میں کبھی بھی یاسمین بجو
کے لیے کوئی لفظ نہ ہوتا جو انہیں سراہتا مگر وہ ایسی
درویش منش تھیں کہ وہ اس پر ہی خوش تھیں انہیں
اپنی زندگی کی اس چال پر کوئی اعتراض نہ ہوتا کم از کم وہ
اس چال کے ساتھ ساتھ زندگی کا سفر تو کسی حد تک
طے کر رہی تھیں ورنہ ان کے گھر کا ماحول مکمل مسجد
جیسا ہی تھا۔ پتا نہیں کیسے بڑے بھیا نے ان کے کالج
جانے کا مقدمہ لڑا تھا اس لیے وہ اسی ذرا سی آزادی'
مٹھی بھر آسمان پر ہی خوش تھیں۔ پھر طارق بھائی تھے
ابا کی طرح قناعت کی پڑیا بلکہ کہنا چاہیے انہیں نئے
کام کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ ساری زندگی کے
بندھے انداز میں گزارنے کے عادی تھے ان کی اس
عادت کا اندازہ اس بات سے لگا لینا ہی کافی تھا کہ اگر ان
کے گدے کے سرہانے الارم کلاک بائیں جانب ہوتی
تو وہ ہفتوں بائیں جانب ہی رہتی ان کے اندر کچھ نیا
سیکھنے کی امنگ ہی نہیں تھی بس پڑھ لکھ کر ابا کا جنرل
اسٹور ہی تو سنبھالنا ہے۔ یہ ان کا ذاتی خیال تھا اور وہ
اس خیال میں اتنے راسخ العقیدہ تھے کہ پھر دنیا کی طرف
نئی طرح سے دیکھنے کی ہمت مجتمع ہی نہیں کر پائے
تھے۔

ان کے بعد شارق بھائی تھے۔ وہ کھیل کے بہت
دیوانے تھے۔ اسکول میں ہمیشہ غیر نصابی سرگرمیوں
میں اچھے نمبر لاتے تھے۔ اسکول میں ان کی شمولیت
بھی اسی وجہ سے تھی پرنسپل تک ان کا دم بھرتے
تھے۔ بلکہ جن دنوں اسپورٹس سیزن کی وجہ سے وہ
اسکول سے غیر حاضر رہ کر دوسرے اسکولز کے ساتھ
جو کبھی لڑ رہے ہوتے ان ہی دنوں کا سارا سلیبس بھی

پرنسپل اور ٹیچرز کی نظرِ عنایت کی وجہ سے خود بخود انھیں ہیڈ گرل بنا دیا جاتا ٹوئرز ہوں یا امتحان کی تیاریاں وہ سب اضافی بھاری ذمہ داری انھیں فراہم کی جاتیں یہی وجہ تھی کہ وہ گھر بھر میں سب سے زیادہ شارپ ذہن کے انسان تھے کون سا کام کس طرح نکلوانا ہے کیسے نکلوایا جا سکتا ہے کس بندے کو کہاں استعمال کرنا ہے اپنے مقصد میں کس طرح فٹ کرنا ہے انھیں اس میں ملکہ حاصل تھا ابا ان کی کارکردگی سے مطمئن تھے اس لیے ان کی گھر سے ضروری اور غیر ضروری غیر حاضری کو وہ خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایسے ہر موقع پر ابا گھر ... کی کلاس پر سے شارق بھائی کے مختلف گیمز میں جیتے گئے انعامات اور شیلڈ اور وہ ساری تعریف جو ان کے پرنسپل یا دوسرے اسکولز کے مسابقت میں شریک بچوں کے ٹیچر کرتے تھے ایک نشے کی طرح طاری ہو جاتی اور وہ باتیں جو ابھی اماں بھی بتا پائی تھیں کہ بند ہو جاتیں رہ گئی شازیہ تو وہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اس لیے کسی گنتی میں نہیں تھی بلکہ یوں سمجھنا چاہیے وہ دونوں کے کردار کا مجموعہ مرکب تھی صبیحہ بجو ایسے چلتی ہیں ایسے اٹھتی ہیں ایسے بولتی ہیں اماں ایسے موقعے پر یوں کرتی ہیں ابا کو یہ چیز پسند ہے طارق بھائی کو وقت کی پابندی اچھی لگتی ہے شارق بھائی کو گیمز سے عشق ہے اس لیے ان کی نظرِ عنایت کے لیے اس گیمز سے دلچسپی لینا شروع ہے۔

رہ گیا وہ تو باقی گھر والوں کی طرح اس کی نظر میں بھی عجیل احمد کی حیثیت ایک بیٹرل پرابلم چائلڈ سے زیادہ نہیں تھی اس لیے تنہائی بڑھتی اس کے ارد گرد بکھری رہتی بلکہ اسے لگتا کہ تنہائی پانی کی طرح ہے اور قطرہ قطرہ اس کے گرد قلزم کی طرح جمع ہوتی جا رہی ہے نمکین پانی جو نہ پیاس بجھا سکتا نہ سیرابی کر سکتا ہے ... اس کے گرد لفظوں کا ذخیرہ اور بیک ہوتا جا رہا ہے اور بات کہ اس کی زیادہ تر اسٹور روم کی مصروفیات بہت عرصہ چھپی نہ رہ سکیں۔

"یہ عجی اسٹور میں کیوں گھسا رہتا ہے۔" سب سے پہلے اماں نے سوال اٹھایا۔ ابا کی نظر بھی اس کے اندر دیکھنے کی طرح کچھ ڈھونڈنے گئی صبیحہ بجو بھی اس پر الٹے سیدھے نظر رکھنے لگیں اور شازیہ وہ اتنی تیز نکلی کہ اس پر نظر رکھنے کی بجائے اسٹور روم میں جا گھسی۔

ایک پرانی ٹوٹی پھوٹی الماری کتابوں سے اٹی ہوئی تھی کچھ کتابیں دوسری چیزوں پر بھی دھری ہوئی تھیں ایک جگہ بکسوں کے درمیان جگہ صاف کر کے ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا ہوا تھا اور اس کے گرد ایک سائیڈ پر لیمپ رکھا تھا۔ لیمپ اسے شفو باجی نے اس کے تیرہویں ... پر دیا تھا بجلی کا انتظام یہاں پہلے سے تھا اسٹور روم میں گرم کپڑوں اور گرم لحافوں کا بھی بکسا رکھا تھا اور بھی دوسری چھوٹی موٹی چیزیں پڑی تھیں جن کا استعمال ہوتا ہی رہتا تھا اور جو جگہ کی کمی کی وجہ سے عام حالت میں اسٹور روم میں ہی رہتی تھیں اس لیے بجلی کا انتظام بہتری رہتا تھا شازیہ نے اسٹور روم کو دیکھا تو چیخ ماری۔

"اماں ادھر تو آئیں! اسٹور روم دیکھیں یہ تو ہمارے اسکول کی لائبریری لگ رہی ہے۔" اماں بھاگی ہوئی آئیں اور دوسری چیخ یقیناً عجیل احمد کی تھی اماں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"اچھا تو اب سمجھی میں اسٹور روم کے سارے کام تو نے اپنے ذمہ کیوں لگا رکھے تھے۔ کہیں بھی ہوتا اسٹور روم کی آواز نکلتے ہی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتا۔ یہ کام میں کرتا ہوں میں بھی کہوں یہ لڑکا جو ہر کام میں اپنی مرضی کرنے کا عادی ہے یہ دوسروں کی مرضی کیوں کرنے لگا ہے۔" عجیل احمد نے سر جھکا لیا وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا پھر شام کو ابا آئے تو کتابوں کی فہرست پڑھی گئی منٹو، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، کرشن چندر اور بھی بہت کچھ ابا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ کتابیں تجھے سمجھ آجاتی ہیں۔"

"مجھے کچھ ابا، سب کچھ نہیں سمجھ آتا۔"

صبیحہ بجو نے مثنوی کی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ابا نے تیزی سے کتاب اچک لی۔

"بچے نہیں پڑھتے ایسی کتابیں۔" صبیحہ بجو نے

سا کر ابا کو دیکھا۔

"تو اتنا چھوٹا سا ہے اس نے بھی توڑ دی کیا ہے پھر
ینہ آپ کہتی ہے منٹو سے زیادہ تمھیں سچ کسی نے
نہیں لکھا وہ انسان کی ذہنی مسائل کی بات
ہے انسان کے جذبات پر نظر رکھ کر کچھ لکھتا
ابا نے مشکوک نظروں سے صبیحہ بجو کو دیکھا
ل احمد تو یک دم فیڈ آؤٹ ہو گیا تھا پھر کراری سی
یں ابا نے کہا۔

"تم نے تعلیم جاری رکھنی ہے یا گھر بیٹھنا ہے۔" وہ
جو کو دیکھ کر پھر بولے

"اتنی فیس جو میں بھرتا ہوں تمہارے اچھے
ل کے لیے بھرتا ہوں کہ آگے جا کر کچھ کرلو تم
کے ہاتھ کو نہ دیکھتی رہو اپنے پیروں پر کھڑی لڑکی
کے معاشرے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر تم یہ
کے طرز تحریر میں جا کر اٹک گئیں نا تو پھر تعلیم تو
یں کہیں پڑی رہ جائے گی اور تم خود کہیں اور ملو گی
۔ سمجھ لو مجھے منٹو جیسے لکھنے والے سچ بہت برے لگتے ہیں
چیزیں جو حجاب میں رہیں تو اچھی لگتی ہیں سر عام لا
ر رکھ دی جائیں تو کیا ضروری ہے ہر پڑھنے والا اس کا
ہ سمجھ کر اس غلطی کو نہ کرنے کا عہد کرے یوں
ں تو ہو سکتا ہے کچھ ادھوری باتیں کچھ مکمل تجسس
ا کر دیں بڑھ کر گزرنے کے لیے اکساہٹ بھر دیں اور
یے میں ایسی کسی غلطی کا متحمل نہیں ہو سکتا بس
ط ہو گیا آج کے بعد تمہاری فرینڈ آسیہ تمہاری
ستی کی لسٹ سے خارج۔۔۔" صبیحہ بجو نے کندھے
دکائے انھیں کون سا جینے مرنے جیسی دوستی کا شوق تھا
ہ تو خود مطلب بر آری کی حد تک دوستی کی قائل تھیں
سو یہ معاملہ بہ احسن و خوبی حل ہو گیا تو پھر سے معاملہ
عجیل احمد کی طرف مڑ گیا۔

"ساری کتابیں اٹھاؤ طارق ابھی اور اسی وقت شروع
کی دکان پر میرے ساتھ چلو یہ ساری خرافات ابھی میں
کر آنا چاہتا ہوں۔" عجیل احمد کی آنکھوں میں جان
کھنچ آئی۔

تنی مشکل سے اپنی پاکٹ منی کے ذریعے یہ
کتابیں جمع کی تھیں اور کچھ کتابیں دوستوں کے
بھائیوں بہنوں کی تھیں اور کچھ کتابیں لائبریری کی بھی
تو تھیں۔

"ابا یہ ساری کتابیں میری نہیں ہیں ان میں سے
کچھ کتابیں لائبریری کی بھی ہیں۔" ابا نے اس کی
طرف دیکھے بغیر طارق صبیحہ کو اس کام پر لگا دیا لائبریری
کے نام دیکھ دیکھ کر کتابیں الگ کی جانے لگیں دوستوں
کی کتابیں الگ ہو گئیں تو بہت زیادہ بڑا ڈھیر نہیں بچا
تھا۔

"تم نے اتنی ساری لائبریری کی ممبر شپ کیسے لے
رکھی ہے۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"ابا آپ جو پانچ سو روپے جیب خرچ دیتے ہیں
اس سے ہی یہ ممبر شپ لی تھیں دراصل ہر لائبریری کے
لیے ایک وقت میں صرف تین کتابیں ایشو ہوتی تھیں
اور میری کتابیں پڑھنے کی رفتار بہت تیز ہے۔۔۔" ابا
نے پھر کچھ نہیں کہا طارق بھائی کے ساتھ ڈھیروں
کتابیں لائبریری کو بھیجیں اس نوٹس کے ساتھ کہ
آئندہ اس بچے کو اس طرح کی کتابیں پڑھنے کے لیے
نہ دی جائیں بچوں کا رسالہ یا عمران سیریز کے علاوہ کچھ
نہ دیا جائے۔ وہ گھر آیا تو بہت بد دل تھا کوئی بھی کام
کرنے سے روکنے کے لیے ضروری ہے اسے اچھی
طرح سمجھا کر دلائل دے کر خود ذہن میں یہ بات آنے
دینی چاہیے کہ جو بات کہی گئی وہ اتنی بھی غلط نہیں کچھ
نہ کچھ حقیقت ہے لیکن اگر کسی بات کسی کام سے
روکنے کے لیے ہٹلرانہ انداز اپنا کر یک قلم سب کچھ
موقوف کروا دیا جائے تو ایسی حالت بے بسی انسان کے
اندر بہت سے ادھورے سوالات اٹھا دیتی ہے اور یہی
ادھورے سوالات مکمل تجسس مکمل جواب پانے کی
راہ ڈھونڈ نکال لیتے ہیں اور مکمل تجسس مکمل سچ
جاننے کی خواہش کبھی کبھی بغاوت کا روپ بھی اختیار
کر لیتی ہے اور یہ بغاوت پھر کسی لفظ کسی تسلی سے
ٹھنڈی نہیں کی جا سکتی۔

یہی حالت عجیل احمد کی تھی وہ بظاہر زمین پر لیٹا
تھا مگر لگتا تھا کانٹوں پر کھینچ لیا گیا ہو کتابوں سے دوری

نے اس کے اندر غصہ بھر دیا تھا تب تو چھین لی گئی تھی ساتھ میں اسے اس پر بھی خفگی تھی کہ ابا اور اماں نے اس پر دوبارہ یقین کرنا چھوڑ دیا انہیں لگتا تھا کہ وہ ایک برا بچہ ہے۔ بس یہی خیال اس کے اندر جم گیا پھر ابا نے جب اسکول کے بعد اسے زبردستی جنرل اسٹور پر بٹھانا شروع کر دیا تو اس کے اندر کا غصہ بڑھتا چلا گیا۔

ابا اسے صرف جنرل اسٹور پر ہی نہیں بٹھائے رکھتے تھے بلکہ وہ اپنے تئیں اس پر کڑی نظر رکھتے تھے جیسے آٹھ برس کی وہ وہی غلطی کر بیٹھے گا۔

"میں برا بچہ نہیں ہوں بس وقت سے پہلے سوچنے لگا ہوں۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ شفو باجی سے ملا تو بے ساختہ رونے لگا اپنی ساری بپتا کہہ سنائی 'شفو باجی نے فوراً اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پہلی بار اس کی شخصیت کا مان رکھا اور انسان ہمیشہ ایسے لوگوں کو یاد رکھتا ہے جو آپ کے غم میں بھلے اپنے کسی غم کو روئے ہوں مگر ان کے آنسو آپ کے ساتھ نکلے ہوں اور ایسے لمحے میں جب ساری دنیا بے اعتنا ہو کر آپ کو دیکھے اور کوئی اچانک آکر آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے 'اسے آپ کی ذات پر اعتبار ہے۔" اسی احساس سے تو زندگی پیاری لگنے لگتی ہے سو یہی احساس اسے شفو باجی سے ملا تھا اس لیے اب وہ نظر بچا کر یہاں چلا آتا خود شفو باجی بھی کتابیں پڑھنے کی رسیا تھیں سو وہ اپنے پڑھنے کی تسکین یہاں پوری کر کے آخر گھر سے اس کی دوری پہلے کے مقابلے میں بڑھتی چلی جا رہی تھی کبھی کبھی شفو باجی اس کے گھر سے دوری پر اسے سمجھانے بھی لگتیں مگر وہ سن کر صرف ایک جملہ کہتا۔

"کیا میں یہاں نہ آیا کروں۔" "بس پھر شفو باجی کچھ بھی نہ کہہ پاتیں اماں اور ابا کی مشکوک نظریں اس پر رہا کرتیں 'اسے لگتا وہ گھر میں بالکل اکیلا ہے کوئی ایک بھی تو اس کی بات سمجھنے والا نہیں تھا۔ وہ بظاہر مشکل باتیں نہیں کرتا تھا مگر سمجھنے والے آسان باتوں کو بھی مشکل سمجھ کر اگنور کر دینے کے عادی تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ فرسٹ ایئر کے پیپرز دے رہا تھا جب صبیحہ بجو کی شادی طے پا گئی نازنین بجو کے بڑے بھائی کو اچانک ہی صبیحہ بجو اچھی لگنے لگی تھیں بڑوں نے نہایت محبت سے رشتہ مانگا تھا لیکن اس نے محسوس کیا تھا جیسے صبیحہ بجو نے کالج کی طرح یہاں بھی نازنین بجو کو جیت لیا تھا۔ وہاں ان کے لفظوں سے جس طرح وہ اسٹیج پر کھڑی اعتماد سے مسکرا کر تعریفیں سمیٹتی رہتی تھیں یہاں بھی انہوں نے ان کے لفظوں سے اظفر بھائی کا دل جیتا تھا۔ بس اچانک یہ راز معلوم ہوا تھا وہ ان کی شادی کے بعد سیکنڈ ایئر کی بکس ڈھونڈنے ان کی کتابوں کی الماری میں کتابیں ٹٹول رہا تھا تو ایک لفافے میں بہت سارے خطوط اس کی انگلیوں سے چھو گئے۔ کتنی ساری تمنائیں تھیں جو اس کی انگلیوں کے کھردرے لمس میں سج بس کر صندل کر گئی تھیں محبت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا اور یہ سب طارق بھائی کے نام لکھے گئے خط تھے۔

نازنین بجو بہت خاموش رہنے والی لڑکی تھیں یا ان سے اس قسم کے یک طرفہ طور پر اظہار کی توقع نہیں تھی ان جیسی ڈری سہمی لڑکی سے یہ توقع ہی عبث تھی کہ وہ اتنے واضح لفظوں میں کچھ کہیں گی۔ وہ چپکے سے لفافہ اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

طارق بھائی کی نوکری اور جنرل اسٹور سے کافی بچت ہو گئی تھی گھر کے اوپر بھی تین کمرے بن گئے تھے یہ اور بات کہ اس کے حصے میں جو کمرہ آیا تھا۔ اس میں فرنشڈ کمروں والی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ پلستر تھا نہ ہی کوئی اور خوب صورتی ایک سائیڈ اس کا بیڈ اور تکیہ تھا کمرے میں ایک ٹیوب لائٹ تھی ایک ٹیبل اور کرسی تھی جو سیکنڈ ہینڈ اچھی حالت میں کم پیسوں میں مل گئی تھی۔ طارق بھائی اپنے دوست کے ابو کے توسط سے دبئی میں ڈرائیور کی نوکری کرنے لگے تھے سال میں صرف دو مہینے کے لیے آتے تھے۔

اس نے خطوط پڑھنے شروع کیے یہ خطوط انہی تاریخوں میں لکھے گئے تھے اور خطوط کی عبارت سے لگتا تھا معاملہ دونوں طرف سے چل رہا تھا سوالوں کے جواب دیے گئے تھے بہت پیار سے بہت ہی ادب بھرا

وف کوئی تھرڈ کلاس بات لکھی ہی نہیں تھی اس نے
ماشروع کیا مگر ایک لمحہ بھی ایسا یاد نہیں آ کے دیا
میں طارق بھائی کی نظر التفات ماشفین بجو پر اور
ے خاص رہی ہو پھر یہ سب کیا تھا۔ اس نے
ر بجو کے گھر جانے کا اچانک پروگرام بنا لیا تھا اماں
سنا تو آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔
"یہ تمہیں اچانک گھر سے دلچسپی کیوں پیدا ہو
"

"کیا ہے اماں' ہر وقت ایک جیسی بے خبری کی
ت اچھی لگے یہ ضروری نہیں۔" اماں نے پھر کچھ
یا تھا ہاں بس صبیحہ بجو کے لیے خاص طور پر انہوں
سی کے حلوے کی ٹکڑیاں اور چنے کی دال کا حلوہ
ت کو ابا کی فرمائش پر بنایا تھا ایک باشیات میں رکھ
یار اس کے حوالے کر دیا تھا وہ منمنایا بھی تھا۔ مگر
گے آگے ایک نہ چلی تھی اس لیے وہ خاموشی سے
ر باہر آ گیا تھا پھر آدھے گھنٹے بعد وہ صبیحہ بجو کے گھر
حیران رہ گیا۔
دروازہ اظفر بھائی نے کھولا تھا وہ گھر میں آیا تو صبیحہ
آرام سے باہر تخت پر اپنی ساس کے پاس بیٹھے
گھر میں بھی وہ بہت کم ہی کام کو ہاتھ لگاتی تھیں تو
بھی یہی روش تھی۔
سے عجیب سا لگا صبیحہ بجو کی ساس کی آنکھوں میں
دیکھ کر اچانک شکایت آ گئی تھی مگر وہ عموی
اؤں کی طرح کی ایک بیٹے کے گھر چھوڑنے کے
و مرے بیٹے کے ہاتھوں مجبور ماں کے سوا کوئی تاثر
دے سکی تھیں۔ سارے گھر کا بوجھ ایک طرح
اظفر بھائی کی اچھی جاب نے ہی سنبھالا ہوا تھا اس
بہت سی ناپسندیدہ باتوں پر بھی صبیحہ بجو کے ساتھ
ہو ماز کرنا ان کی مجبوری تھی۔
"تم کھانا تو نہیں کھا کر آئے ہو گے ۔۔۔" بہت
ت سے کیا جانے والا سوال انتہائی بے ڈھنگے انداز
صبیحہ بجو نے کر ڈالا' اظفر بھائی کے اندر کسمساہٹ
کر بیوی کے سامنے انتہائی تابع دار قسم کے شوہر
ے کا ثبوت دے کر وہ پھر سے اعصاب ڈھیلے چھوڑ

کر بیٹھ گئے تھے اس نے اماں کا دیا گیا باٹ پاٹ بجو کی
طرف بڑھایا تو صبیحہ بجو نے فوراً" ہاتھ کے اشارے
سے کچن کی طرف اشارہ کیا۔
"جا کر تاشی کو دے آؤ وہ اس وقت کچن میں دوپہر کا
کھانا تیار کر رہی ہے۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر کچن کی
سمت چلا آیا۔ ماشفین بجو پسینے میں شرابور روٹیاں بیلنے
میں مصروف تھیں عجیل کو دیکھا تو مسکرا کر اس کا
استقبال کرتے ہوئے بولیں۔
"ارے بھئی تم' بہت اچھا کیا تم یہاں آ گئے میں تم
سے مل کر دیکھنا چاہتی تھی کیا واقعی تم بھی میری
کیٹگری کے ہو یا نہیں۔"
"کیٹگری ۔۔۔" اس نے طنز سے ہنس کر سوالیہ
دیکھا اور وہ عجیب بے بسی سے مسکرائیں۔
"ہاں ہماری کیٹگری ہمیشہ دنیا میں سب سے الگ
ہی ہوتی ہے بلکہ ہوتی نہیں ہے بنا دی جاتی ہے جیسے
کلیسا کے دور میں ایک وقت میں کوڑیوں کو بالکل الگ
تھلگ پہاڑوں میں قید کر دیا جاتا تھا ہم سوچنے والے
لوگ بھی ایسے ہی ہیں بہت کم سراہے جاتے ہیں زیادہ
تر حدف تنقید بننا ہی ہماری قسمت ہے۔" لمحہ بھر کو
رکیں پھر مکرر بولیں۔
"صبیحہ بھابی نے ہمیشہ تمہیں جس طرح ڈسکس
کیا تھا میرا دل چاہتا تھا میں ایک بار تو اس بندے کو دیکھوں
جو میری طرح کی اذیت انگیز زندگی جی رہا ہے کیا واقعی وہ
یہ زندگی ڈزرو کرتا ہے۔"
"پھر کیا پایا آپ نے ۔۔۔" اس نے سنجیدگی سے
سوال کیا اور وہ مسکرانے لگیں۔ پھر گہرا سانس لے کر
بولیں۔
"میرے خیال میں ہم ایسی ہی زندگی کے مستحق
ہیں' ہم جو چاپلوسی نہیں کرتے کسی اور کے دماغ کی
سوچی ہوئی بات کو یک قلم اپنا نظریہ نہیں بنا لیتے' کسی
بھی نئی بات کو ماننے کے لیے دلیل چاہیے ہم جو کتابی
باتوں کو عملاً" زندگی میں گزارنا چاہتے ہیں ان باتوں کو
ہوتے ہوئے دیکھنے کے خواب دیکھتے ہیں اور خواب
دیکھنا آسان کام تو نہیں خوابوں کا راستہ ہمیشہ خار زار اور

مشکل سے ہو کر گزرتا ہے سو ہم اسی کے مستحق ہیں جو ہم ہیں سہ رہا ہے۔"

اس نے پوری توجہ سے انہیں دیکھا اس کے اندر جیسے ایک ایک لفظ شدت کا ہاتھ پکڑے خود کو شدت کے پاؤں صبر کے بندھن سے بلند کر کے اندر دل کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

وہ واقعی ٹھیک کہتی تھیں زندگی میں سوچنے والے بہت کم خوش ہوتے ہیں۔

اور بقول شعوبلی ہم جیسے لوگ جن کے ذہن رہن نہیں رکھے ہوتے ہم لوگ جوانی دیکھتے ہی نہیں ہیں ہم لوگ پیدا ہوتے اور یک دم بڑھاپے کی دہلیز پر آن بیٹھتے ہیں۔

اور ہم میں سے کچھ لوگ جو تخیل کی پرواز تیز رکھتے ہیں وہ تو پیدا ہی بوڑھے ہوتے ہیں انہیں جوانی کی ترنگ چھو بھی نہیں سکتی اور ملنے والے ان پر تکلف لیبل لگاتے چلے جاتے ہیں۔ سنکی، احمق، پاگل۔

"سوچنے والے دماغ ہمیشہ پاگل خانے ہی کیوں آباد کرتے ہیں دنیا میں کوئی پھول کیوں کھلانے کا کارنامہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔"

اس نے سوچا اور بہت کچھ کہنے آیا تھا کہے بغیر گھر واپس لوٹ گیا۔ عائشہ خالہ اسے روکتی رہ گئیں مگر صبیحہ بجو نے ان کا ساتھ اتنی بے دلی سے دیا تھا کہ وہ روکا ہی نہیں گھر آ کر اس نے اپنے اندر اٹھنے والے سوال کو پھر سے اپنے اندر دوہرایا۔ پھر اس نے بہت سی آنکھیں کھنگالیں اور ایک بات سمجھ گئی۔

بہت کم سوچنے والے ایک فرد سے تبدیلی کا عمل اٹھاتے تھے ہمیشہ ہر شخص نے ہر دور میں سارے معاشرے کو یک دم سے تبدیل کرنے کی مہم جوئی اختیار کی بہت کم لوگ تھے جو کامیاب ہوئے اور بہت زیادہ لوگ تھے جو اس مہم جوئی میں کام آئے ان کی سوچ ان کے بہت بعد میں سراہی گئی۔

آپ جب بہت بولتے ہیں تو بہت کم سنتے ہیں اور جو کم سنتا ہے وہ بہت کم بول پاتا ہے ہمیشہ سمجھنے والے خاموشی میں گنگناتے ہیں اور جو اس خاموشی کے سُر کو سمجھ لیتے ہیں وہ بہت کم بے کل ہوتے ہیں ایک فرد۔؟ کوشش ہمیشہ ہندسوں کی بہت ساری اکائیوں سے ہٹ کر ہمیشہ "ایک" سے شروع ہوتی ہے ارب اور کھرب بھی اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچائے جا سکتے جب تک صفر کے بعد ایک کا ہندسہ نہ شروع کیا جائے۔

ہمیشہ وہ سوچتا آیا تھا لیکن آج کچھ کرنے کی امنگ اس کے دل میں ٹھاٹھیں مارنے لگی تھی، طارق بھائی پندرہ دن بعد آنے والے تھے اور اس نے ان کے آنے سے پہلے کسی کے لیے ہوم گراؤنڈ تیار کرنا تھا۔

اب وہ ایک دن چھوڑ کر ماشفین بجو سے ملنے کے بہانے صبیحہ بجو کے گھر چلا جاتا تھا مگر ابھی تک موقع نہیں ملا تھا کہ وہ کوئی ڈھنگ کی بات کر پاتا پھر اچانک ایک دن اسے یہ موقع مل ہی گیا عائشہ خالہ چھوٹے عمار کے ساتھ لاہور ایک شادی میں گئی ہوئی تھیں بظاہر انہیں گئے تو ایک ڈیڑھ ہفتہ ہو گیا تھا مگر اظفر بھائی اور صبیحہ بجو کو ایک بزنس پارٹی میں جانے کے لیے ان کے گھر کی یاد آئی تھی اظفر بھائی ماشفین بجو کو چھوڑ کر پارٹی میں شرکت کے لیے رخصت ہو گئے تھے انہوں نے کھانا کھا لیا تھا پھر شام کی چائے لیے وہ دونوں چھت پر چلے آئے تھے۔

ماشفین خلا میں دیکھ رہی تھیں مگر ان کے چہرے پر دل کی تمنا اتنی واضح تھی کہ زندگی کی پیاس میں خود بخود وا ہونے کو ترستی تھیں وہ انہیں کچھ دیر دیکھتا رہا پھر آہستگی سے بولا۔

"آپ کو کسی نے بہت آسانی سے جیت کر لیا ہے نا بجو۔!" ماشفین کی آنکھوں میں ایک لمحہ آ کر ٹھہر گیا تھا مگر وہ اب بھی چپ رہیں، نہیں بولیں۔

"تم۔۔۔ یہ وضع دار اور محبت سے چور لوگ۔" اس نے ٹکٹکی سے انہیں دیکھا پھر نئے سرے سے بولا۔

"صبیحہ بجو نے آپ کے ساتھ ہمیشہ کی طرح گیم کیا ہے نا انہوں نے کچھ خطوط دیے ہوں گے جن کے جواب آپ نے اپنے رنگ میں لکھے اور انہوں نے آپ کے لفظوں سے اچھے دل کی بازی جیت لی آپ کو

ہی نہیں چلا ہو گا کون قیامت کی چال چل گیا
ب پتا چلا ہو گا تو بازی آپ کے ہاتھ سے نکل گئی

شفین کچھ نہیں بولیں۔ جواب میں کہیں ان کا
پ گیا تھا اس نے ایک لمحے کو نظر ادھر ادھر کی
ر شفین پر گاڑ کے بولا۔
"پلیز بجو مجھے یہ آنسو پینے صبر جھیلنے والے لوگ
زیادہ اچھے نہیں لگتے کوئی بھی جذبہ ہو توازن میں
ہیں لگتا ہے صبر کی انتہا سامنے والے کو ظالم بنا دیتی
اور یہ اس شخص سے بھلائی کا برتاؤ نہیں آواز اٹھانا
و بجو آواز اٹھانا سیکھو۔"
"ہماری آوازیں ہمارے گلوں ہی میں مر جانے کے
نی ہیں عجی..... تمہیں نہیں پتا ایک دفعہ آپ
نے کسی حق سے دستبردار ہو جائیں تو سب کو لگنے لگتا
ہمیشہ کی رویہ ان کا حق ہے اگر کبھی جو کسی بات پر
باج کرنے کی جرأت بھی کر بیٹھیں تو یوں معتوب
رار دیے جاتے ہیں جیسے کوئی دیوتا انسان ہونے کا رنج
پنچے اور پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ ایسے افراد کو منانے
خیال تک کسی کے دل میں نہیں آتا یوں جیسے ہر
بیز ان کے لیے سوغات جیسا ہی ہے انہیں ہر چیز
برداشت کرنی ہے یہی ان کے ہونے کی سزا ہے۔"
عجیل احمد تاشفین کو دیکھنے لگا وہ اور تاشی بجو
یں ایک ہی کشتی کے سوار تھے مگر کسی ایک کو تو کنارہ
ہی جا پہنچنا تھا نا!
اس نے چائے کا کپ چھت کی منڈیر پر رکھا پھر
گی سے بولا۔
"آسیہ آپ کی کیسی دوست ہے؟" تاشفین نے
ک کراہ کے دیکھا پھر آہستگی سے بولیں۔
"آسیہ میری نہیں صبیحہ بھابھی کی دوست تھی وہ
یں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔"
عجیل احمد پھر بولا۔
"کیا آپ کو معلوم ہے آسیہ بجو کے گھر صبیحہ بجو
لیے انظفر بھائی کے خطوط آیا کرتے تھے۔ ان کا
وڈ بہت بڑا ہے وہاں ایک دوسرے کی ڈاک نہیں

چیک کی جاتی ٹیوشن انسٹی ٹیوٹ میں ان کے میل
اسٹوڈنٹ بھی دوست تھے اس لیے یہی روشن خیالی بجو
کا کام آسان کرتی رہی۔ کیا آپ کو معلوم ہے وہ خطوط
جو آپ کے انظفر بھائی بجو کو بھیجتے تھے وہی خطوط بجو ٹیڈ
کر کے آپ کو طارق بھائی کی جھوٹی محبت کی داستان
کے ساتھ ارسال کرتی رہی ہیں لفظ آپ کے تھے اور
انظفر بھائی الگ مزاج کے بندے ان لفظوں کی خوب
صورتی کے اسیر ہو گئے ہمیشہ کی طرح انہوں نے آپ
کی ذات کو استعمال کیا ہے... کیا آپ کو معلوم ہے۔"
تاشفین کتنی دیر عجیل احمد کو دیکھتی رہیں ان
جیسی سادہ مزاج لڑکی یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھیں کہ
محض ان کی دوستی کا دم بھرنے والی لڑکی ان کے گھر میں
اس طرح چور دروازہ ڈھونڈ نکالنے کی مہم میں جتی ہوئی
تھی صبیحہ کیا اس کا تو بھائی تک ان سے مخلص نہیں تھا
وگرنہ یہ خبریوں نہ چھپاتا اتنی پیار بھری بات جس پر
بہنوں کے دل خوشی سے جھوم جاتے ہیں کیا وہ خوش
نہیں ہوتیں؟ شاید صبیحہ نے انظفر سے کہا ہو گا۔ تاشی
اس کے اور انظفر کے تعلق کو اچھی نظر سے نہیں
دیکھتی وہ ان دونوں کو ملانے کی بجائے انہیں الگ
کرنے کا کوئی بھی کھیل کھیل سکتی ہے اور اس کا بھائی
خاموشی سے یہ نکتہ مان گیا ہو گا۔
ان دنوں وہ گھر والوں کی پریشانیوں بڑی بھابھی کی
ریشہ دوانیوں اور مظفر بھائی کی مجرمانہ خاموشی سے یوں
ہی چڑی رہتی تھیں ایک دو بار انہیں یاد آنے لگا تھا کہ
انظفر نے صبیحہ کے متعلق بات شروع کی بھی تھی اور
انہوں نے اس کی بات رد کر دی تھی منفی بات بھی وہ
اپنے ٹوٹنے والے گھر میں مزید کوئی شگاف ڈالنے کی
کیسے ہامی بھر سکتی تھیں۔ ان دنوں انہیں ہر لڑکی جو بھابھی
بنائے جانے کے خیال سے ذہن میں آتی یک دم سے
اپنے گھر کی دشمن لگنے لگتی تھی کتنے بہت سے لمحے تھے
جو ایک کے بعد ایک انہیں یاد آ کر رہ گئے تھے وہ کتنے
دنوں سے بے وقوف بنائی جا رہی تھیں اور ان کی سمجھ
!
ان کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی بھر آیا پہلے ایک

خیال تو ہاتھ میں تھا کہ وہ طارق کے دل میں کہیں نہ کہیں چھپی ہیں اپنے لکھے لفظ تنہائی میں جگنو بن جاتے تھے انہیں تسلی اور دھارس دیتے تھے انہیں ابھی تھپکیاں نہیں ملی تھیں مگر تلاش معاش سے جب بھی تھک کر ایک گھر بسانے کا خیال دل میں موجزن ہوا تو تم ہی میرے ہمراہ ہو گی۔"

اتنی بڑی اس دنیا میں
اپنے نام کی میں نے ایک عمارت
کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر کھڑی کی ہے
پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو
میں نے بھی اک گھر ہے بنایا
رنگوں پھولوں تصویروں سے اس کو سجایا
دروازے کی اوٹ پہ اپنا نام لکھایا
لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!

یکدم وہ اسی کیفیت میں چلی گئی تھیں اور ارد گرد بہت سارے لفظ اس نظم کا ہاتھ تھامے ان کے اندر گنگنانے لگے تھے۔

"لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو۔"

انہوں نے اس نظم کو پڑھ کر کتنی بار آئینے سے نظریں چرائی تھیں۔ مسکراہٹ ان دنوں سہیلی بنا کرتی اور خواب دیکھتے رہنا صرف اپنا حق محسوس ہوتا مگر آج ان تمام باتوں سے پردہ ہٹ گیا تھا واقعی بے خبری جنت ہے مگر اب ان کے پاس کیا تھا انہوں نے خالی ہاتھ اپنے آگے پھیلا لیے۔

"ان ہاتھوں میں کوئی چیز نہیں ٹکتی" اماں کہتی تھیں "تیری ہتھیلی میں تو چھید ہے پیسہ نہیں رکتا۔" وہ ہنس دیتی تھیں اور دل چاہا وہ اماں کو جا کر بتائیں واقعی ان کی ہتھیلی میں چھید ہے اس میں پیسہ تو کیا کچھ بھی نہیں ٹکتا۔

"محبت تو کتنی ظالم ہے تجھے ذرا ترس نہ آیا۔" دل نے دہائی دی اور عجیل احمد نے شفقت کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"جو پہلے جھوٹ تھا وہ میں سچ کر کے رہوں گا بجو۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں مجھے بھیک میں ملی محبت قبول نہیں میری عزت نفس یہ گوارا نہیں کرے گی۔"

عجیل احمد شفقت کو سراہنے والی نظروں سے دیکھنے لگا پھر آہستگی سے بولا۔

"طارق بھائی کا دل کورے کاغذ کی طرح ہے بجو پسندیدگی تو شاید ان کی زندگی میں بہت سی لڑکیوں نے حاصل کی ہو گی مگر آج تک محبت کا دم انہوں نے کسی کا نہیں بھرا پھر یہ بھیک میں ملی محبت کیوں ہو گئی آپ دل صاف کریں اور اپنے بھائی پر اعتماد کریں' چال چلنا تو ہمیں بھی آتا ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولیں اور یہی ان کی خاموش رضامندی تھی پھر باقی کا کام عجیل احمد کا تھا گو وہ بہت چھوٹا تھا لیکن صبیحہ بجو سے کبھی کبھی وہ بے دھڑک دل کی بات کر ہی لیا کرتا سو جب اس نے یہ خیال ظاہر کیا تو صبیحہ بجو پہلی ساعت بدک گئی تھیں جب اس نے ایک آنکھ دبا کر سازشی انداز میں سمجھانے کو کہا۔

"بجو آپ میری بات نہیں سمجھ رہیں' ورنہ اپنے حق میں کی ہوئی بات پر آپ اتنا بدکتی نہیں۔"

"میرا کیا فائدہ ہے اس بات میں۔" صبیحہ بجو ساری عمر دو اور دو چار کی جگہ دو اور دو پانچ کرنے کی عادی تھیں اس لیے فوراً" تاجرانہ انداز میں متوجہ ہو کر سوالیہ انداز میں بولیں اور بس یہ کام اس کے لیے نہایت آسان ہو گیا سو وہ پلان بتانے کو دھیمی آواز کر کے بولا۔

"سیدھی سی بات ہے بجو ابھی شروع کے سال اظفر بھائی آپ کی ہر جائز ناجائز بات ماننے کو تیار رہیں گے لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کبھی وہ آپ سے اپنا مزاج بدل لیں۔"

"خدا غارت کرے تجھے کیوں بدفال نکال رہا ہے عجیل۔" وہ تڑپ کر بولیں اور وہ ہنس کر بولا۔

"یہ بدفال نہیں ایک خیال ہے جو عموماً" ننانوے فیصد شادیوں میں اپلائی ہوتا ہے پھر ایسے میں لڑکی بے دست و پا ہو کر مجبور سی ہو جاتی ہے لیکن اگر تاشی بجو کی شادی طارق بھائی سے ہو جائے تو اظفر بھائی بس

اگر اجڑنے کے خوف سے آپ کے سامنے اونچی
آواز میں نہیں بول سکتے اور عائشہ خالہ وہ بھی آپ کی
غلطی میں رہیں کہ آپ دن کہیں گی تو دن کہیں گے
آپ رات کہیں گی تو سب رات اوڑھ کر سو
جائیں گے"
صبیحہ بجو کی یکدم آنکھیں چھلکنے لگی تھیں۔ عجیل
احمد کا کام پورا ہو گیا تھا اب اس مقدمے کی پہلی سماعت
کا بھی فیصلہ عجیل احمد کے حق میں ہی ہونا تھا اسے
یقین تھا آج بہت مختلف سوچنے والے عجیل احمد نے
بہت عام طریقے سے بات کہہ کر میدان جیت لیا تھا
کتابیں قلم دیتی ہیں لیکن یہ بھی غلط تھا کہ وہ کتابوں
کے چکر میں پڑ کر انسان سے دور ہو گیا تھا ہر چیز توازن
مانگتی ہے اور یہ توازن اسے برتنا آ گیا تھا سو طارق بھائی
کے آتے ہی اس کی کسی بات کے پیش نظر خود صبیحہ بجو
نے پہلے الطاف سے اس رشتے کی بات کی تھی اور پھوپھا
سے معاملہ اوکے ہو گیا تو اپنے گھر میں یہ مقدمہ شروع
کیا پہلی پیشی پر بات ماشفین بجو کے حق میں رہی تھی
طارق بھائی کے ذہن میں شادی کے لیے صرف ایک
ہی فارمیٹ تھا لڑکی دیکھنے میں اچھی تو ہو لیکن گھر
بنانے والی ہو سو جب اضافی خوبیوں کی بات چلی تو ان
کو انکار کیوں ہوتا شادی کی تیاری ایمرجنسی میں ہوئی
تھی ماشفین ایک مہینے میں ہی اس کے گھر آ گئی تھیں۔
طارق بھائی اور وہ بہت خوش تھے اور انہیں دیکھ کر
بھی خوش تھا ابا اور اماں اس کے بدلے ہوئے رویے
پر حیران تھے وہ جو گھر سے بھاگنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا
اب گھر میں رہنے کے بہانے تلاش کرتا تھا اور ماشفین
بجو اسے تشکر سے دیکھتیں جو محبت لفظوں میں بھی
نہیں تھی وہ محبت اب پورے استحقاق سے ان کی
جھولی میں تھی۔ رہا شارق تو وہ انڈر نائنٹین میں کھیلتے کھیلتے
بہت جلد قومی ٹیم میں شامل ہو کر ہمیشہ دورے پر ہی
رہتا تھا تعلیم اس نے درمیان میں ہی ادھوری چھوڑ
دی تھی زیادہ وقت کھیل ہی میں گزر جاتا تھا اس لیے وہ
تعلیم مکمل نہیں کر سکا تھا۔ ابا کو شکایت تو ہوئی تھی
لیکن اس کی آتی ہوئی آمدنی اور کرکٹ کی وجہ سے ملنے

والی اچھی نوکری نے سارے عیب چھپا دیے تھے رہا وہ
تو وہ ابھی تک اسٹرگل کر رہا تھا تعلیم میں اچھا تھا مگر
ابا کو پھر بھی لگتا تھا ان کی اولاد میں سب سے نکما اگر کوئی
ہے تو وہ صرف عجیل احمد ہے اسے نہ دنیا کرنی آتی
تھی نہ دین کے بارے میں کچھ جانتا تھا بس مرے
ہوئے "سنکیوں" کی اول فول پڑھ کر سیکھ کر اپنی
زندگی کے گولڈن پیریڈ کو برباد کر رہا تھا بات یہاں تک
رہتی تو قابل قبول تھی لیکن جب اس نے ماس
کمیونیکیشن میں ایم اے کے ساتھ ساتھ ایک این جی
او بھی جوائن کرلی تو ابا کو پکا یقین ہو گیا کہ ان کا یہ بیٹا ہاتھ
سے نکل گیا ہے فارغ وقت میں وہ اپنے ایک دوست
کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کو بھی وقت دینے لگا تھا سو گھر
میں اس کی آمد بہت غیر متوقع رہتی تھی۔
وہ جب گھر سے نکلتا اکثر لوگ خواب خرگوش کے
مزے لوٹ رہے ہوتے اور جب گھر میں داخل ہوتا تو
صرف ماشفین کے علاوہ کوئی جاگ نہیں رہا ہوتا۔ اس
نے کتنی مرتبہ منع کیا تھا وہ اس کے لیے نیند مت
خراب کیا کریں مگر ایک جنون سا ہونے کی سرخوشی تھی وہ
جاگتی رہتی تھیں اور وہ تھا۔ ایک بیابان کی خواہش میں
مارا مارا پھرتا ماشفین پہلے تو برداشت کرتی رہیں پھر ایک
دن اسے اچانک جا لیا۔
"الگ سوچنے کا مطلب یہ تو نہیں انسان سب سے
الگ ہی ہو جائے۔" عجیل احمد جو ٹیبل پر بیٹھا کچھ
لکھ رہا تھا چونک کر دروازے کو دیکھنے لگا سامنے
ماشفین کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
"آپ! آئیے بھابھی بیٹھیے نا۔" اس نے فلور
کشن کی طرف اشارہ کیا۔ اب اس کا کمرہ کچھ کمرہ لگنے
لگا تھا۔ نئے پردے کریم کلر کا پینٹ ایک فوم کا گدا جو
بچھا تو زمین پر ہی رہتا مگر جس کی بیڈ شیٹ ماشفین ہر
چوتھے روز لازمی بدلتی کیونکہ وہ بہت کم صفائی کا خیال
رکھتا کبھی گندے پیر لے کر چڑھ جاتا کبھی طارق بھائی
کے بچے خود اس کی بیڈ شیٹ پر نقش نگار بنا لیتے اس کی
الماری میں کپڑے بھی ہر وقت اسے سلیقے سے ملنے
لگے تھے ہر روز ایک سوٹ ہینگر میں استری شدہ ملنے لگا

تھا اور یہ سب جس کے مرہون منت تھا اس کو مسکرا کر دیکھا اس کا حق بنتا تھا۔ ناشفین ظہور کشن پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگیں۔ پھر کتنی ساعتوں بعد انہوں نے پوچھا تھا۔

"آج کل کیا مصروفیات ہیں تمہاری؟ کچھ خبر ہی نہیں دیتے۔" اس نے قلم قلمدان میں رکھا پھر ہنس کر بولا۔

"صرف آپ کو ہی احساس ہوتا ہوگا میرے نہ ہونے کا ورنہ گھر کے باقی لوگ تو غنیمت سمجھتے ہوں گے کہ میں گھر میں نہ ٹکوں تو اچھا ہے۔"

"ایسی بات مت کرو گھر کا ہر شخص تمہیں مس کرتا ہے یہ اور بات ہر ایک کے اظہار کا طریقہ الگ ہے لالہ بخت ست سنا کر تم پر اپنا حق جتاتی ہیں تو ابا مجھے میں چیخ چلا کر بس اظہار کو ضروری سمجھتے ہیں ویسے نئی کیا مصروفیات اختیار کرلی ہیں کہ رات کے تین بج جاتے ہیں تمہیں۔"

اس نے تختی پر رکھا ایک نیا نکلنے والا اخبار دکھایا اس اخبار کا نام ناشفین نے بھی سن رکھا تھا سو چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟" اخبار سامنے لہرایا تو وہ کالر اکڑا کر بولا۔

"اس کا سیدھا مطلب ہے میں اس اخبار میں سب ایڈیٹر بن گیا ہوں کالم نگاری الگ ہے سو اس لیے وقت بہت شارٹ ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی تو میں خود سے بھی نہیں ملتا۔"

پہچان پانے کی خواہش اسے کتنا دوڑانے لگی تھی الگ سوچنا سب سے ہٹ کر زندگی گزارنے کی عادت اب اس کے خون میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ وہ اور سب کی طرح جینے کا انداز سیکھنا بھی چاہتا تو نہیں سیکھ سکتا۔ ناشفین اسے ابھی بھی دیکھ رہی تھیں پھر یکدم انہوں نے اس پر ایک نیا سوال اٹھایا۔

"تم نماز کیوں نہیں پڑھتے ہو؟"

"کیا ہو گیا ہے بھابھی آج آپ ابا کی ٹون میں کیوں بولنے لگی ہیں۔" وہ ہنسا مگر ناشفین کی سنجیدگی میں کوئی کمی نہیں آئی انہوں نے دوبارہ سے پوچھا۔

"دنیا میں انسان کتنا بھی الگ زندگی گزار لے لیکن محبت کا مذہب ایک ہی ہوتا ہے۔ محبت ہمیں سکھاتی ہے زندگی کرنا وصل میں اداسی اور ہجر میں خوشی کرنا محبت سب سکھاتی ہے مگر محبت کا اسم اعظم جاننے والے کیا اس محبت کے خالق کو بھول جاتے ہیں۔"

اس نے سنجیدگی سے ناشفین کو دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"یہ بات میں نے آج تک کسی سے شیئر نہیں کی لیکن یہ میری سوچ ہے کہ مجھے اللہ کے پاس خواہشوں کے عوض جانا اچھا نہیں لگتا میں نہیں چاہتا میں اللہ کی عبادت اپنے کسی ذاتی فائدے کی بات کے تحت کروں مجھے اللہ سے صرف بے غرض محبت کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"یہ تو ایسی ہی دلیل ہے میں روزے میں جھوٹ فریب کالم گلوچ سے غیبت سے نہیں بچ سکتا اس لیے روزہ ہی نہیں رکھتا۔"

"حقیقت میں تو یہ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے۔" عجیل نے تائید میں کہا تو خفگی سے اسے دیکھنے لگی پھر بولیں۔

"تمہیں تم ہر چیز کو لاجک کے تحت سمجھنے کی خو میں اللہ کو بھی اسی طرح کی دلیل کے تحت تو نہیں جاننا چاہتے۔"

وہ کچھ نہیں بولا پھر آہستگی سے بولا۔

"لوگ کہتے ہیں انہیں اللہ سے محبت ہے لیکن میں چاہتا ہوں اللہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے یہ جانوں۔"

"جاننے کے لیے انسان کو ذات کے اندر اترنا پڑتا ہے تم نے اندر اتر کر دل کو ٹٹولا۔"

"کبھی فرصت نہیں ملی۔ بس میرا خیال ہے یہ کالم مسلسل تیزی کے ساتھ یکسوم ہو جاتے ہیں اور آپ تو جانتی ہیں ہم جیسے لوگ اپنی باتوں کے لیے اپنی سوچ پر اپنی عمر یونہی گنوا دینے کے عادی ہیں۔"

ناشفین نے کچھ نہیں کہا۔

اور وہ پھر سے اپنے کام میں لگ گیا گھر میں کیا ہو رہا

ے کیا نہیں اس نے وصیان دینا چھوڑ دیا تھا اپنی این جی
او اور اخبار کی مصروفیت کے تحت وہ بھاگا پھر رہا یہاں
تک کہ ایک دن وہ تھک کے رکا تو اس کے اندر شفقو
بابا کی بات اتری پھری۔

"انسان تیز چلے یا آہستہ دونوں حالتوں میں اکیلا رہ
جاتا ہے۔" آج وہ کمرے میں اپنے بستر پہ لیٹے ہوئے
خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

جس انسان سے اللہ محبت کرتا ہے اسے دل دیتا
احساس بخشتا ہے پھر چاہتا ہے لوگ اس کے اس
احساس سے زندگی کشید کریں انھیں اس سے فیض
ملے جو دماغ دیتا ہے وہ چاہتا ہے اس کی دی گئی سوچ
کتنی ہی عنقا ہونے کے باعث مورد الزام ٹھہرے یہ
سفر رکے نہیں 'بظاہر سوچ کا سفر ہمیشہ رائیگاں دکھائی دیتا
ہے خواب دیکھنے والے مقتل دیکھتے ہیں یا ویرانوں میں
بیٹھے چیخ چیخ کر مر جاتے ہیں مگر اکیلے ویرانے میں مرنے
والے ذہن مرنے کے بعد بھی اپنے خیالات میں زندہ
رہتے ہیں مقتل میں جانے والوں کی ادا مدتوں یاد رہتی
ہے۔

رائیگاں سفر جو کٹنے والے بھی کہیں نہ کہیں کسی کا
انتظار ہوتے ہیں۔ دنیا میں یہ انتظار جیسے کوئی وصل کی
روشنی چمک سنے مگر شفقتی ہی میں کوئی ہے جو دونوں ہاتھوں
سے آب کوثر پلانے کی تمنا رکھتے ہیں جو اپنی امت میں
سے تفکر کرنے والوں پہ محبت کی نظر رکھتے ہیں دنیا
جنہیں سن کر پاگل احمق قرار دیتی ہے وہ ان کی ایمان
داری' وفاداری' محبت کے سلوک پہ ہر موقع پہ ان کا
ہاتھ تھامنے کو تیار رہتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت ہو تا جب
انسان بڑھے ہے علم کو علم دینے والے کی راہ کا رزق
زوال کرکے اتراہٹ کا شکار نہ ہو۔

اگر محض پہچان کی بات ہو پھر انسان کے لیے کوئی
راہ نہیں پہنچتی ہاتھ تھامنے والا ہاتھ تھا تا رہے اور ہم
پھر بھی اس کی محبت کے امتحان لینے بیٹھ جائیں تو؟
قربانی اتھاہ تنہائی کو مقدر بننے سے کوئی کیسے روک سکتا
ہے۔

وہ بھی آج اسی موڑ پہ کھڑا تھا بہت سالوں پہلے کا
پڑھا گیا سبق اسے بھول گیا تھا اس نے اتنے ہاتھ پیچ
کچھائے تھے تو محض اس لیے کہ وہ چاہتا تھا اس کے
ماں باپ پہ اس کی دھاک بیٹھ سکے کہ گورنمنٹ اسکول
سے پڑھنے کے باوجود ہر آسائش سے خود کو بچانے کے
باوجود وہ ان کی ساری اولاد میں سب سے زیادہ کامیاب
تھا۔

اسے اپنی کامیابیاں اتنی عزیز تھیں کہ پھر اس نے
زندگی میں کیا کمی رہ گئی ہے تک کا سوال اپنے اندر
نہیں اٹھنے دیا تھا حکومتی حلقوں میں وہ اچھی ریپوٹیشن
رکھتا تھا بہت دل سے عوام میں پڑھا جاتا لوگوں کی عام
لوگوں کی آواز اونچے ایوانوں میں پہنچانے کا بیڑہ اٹھا رکھا
تھا اس کے اردگرد اس کی شخصیت کے لیے اتنی واہ واہ
تھی کہ اسے آنکھ بند کرتے بھی صرف اپنی ذات دکھائی
دیتی تھی اور آنکھ کھلتے بھی اپنے سراپے پہ نظر ٹھہرتی
تھی وہ اپنے وجود کے اردگرد ہی گھوم رہا تھا اور سمجھنے لگا
تھا اس نے دنیا فتح کرلی ہے اسے محسوس ہوتا جب اس
کے سامنے اس کو پڑھنے والے اسے سراہتے تھے تو
اسے واقعی محسوس ہوتا کہ زمانے کے سینے میں ہم
دھڑکتے ہیں۔ مگر آج اسے عجیب سا جھٹکا لگا تھا اس کے
ہاتھ میں سب کچھ تھا مگر محبت نہیں تھی اللہ نہیں تھا وہ
جو برسوں پہلے کا ایک عجیب سا ہوا کرتا تھا آج اپنے کمرے
میں افسردہ لیٹا تھا۔

کل اس نے چلتے چلتے جس طرح شارق بھائی کی
بات پکی ہونے کی رسم کے بارے میں سنا تھا تو ایک
لمحے کو اس نے دیوار کو تھاما تھا۔

کیا واقعی وہ ان کی زندگی میں کہیں نہیں رہ گیا تھا'
اسے کسی نے نہ بتایا تھا نہ اس سے کوئی رائے لی تھی
کہ وہ ہونے والی بھابھی کے لیے کوئی تمنا رکھتا ہے یا
نہیں وہ سب آپس میں بے حد مصروف تھے اور محسن
شائزہ اور بچے ایک دوسرے کے لیے تھے اور وہ خود؟
وہ ماں اور ابا کی نظر میں ابھی تک کوئی مقام نہیں بنا
پایا تھا ان کی نظر میں وہ ابھی تک 8th کلاس میں
پڑھنے والا عجیل احمد تھا جس سے خیر کی توقع انھیں
ہرگز نہیں تھی۔ اس نے چلتے پنکھے کو دیکھا چادر اپنے

اوپر سے آگری۔ رات چار بجے گھر آیا تھا اس لیے اس وقت بارہ بجے اٹھا تھا۔ واش روم سے فارغ ہو کر بالوں کو تولیے سے خشک کرتا وہ سیڑھیاں اتر تا نیچے آیا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا اس کا اتنی تنہائی سے دل الجھنے لگا تھا مگر کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔

نشفین بھابھی کا خیال اسے ایک بار پھر سے مسکرانے پر مجبور کر گیا تھا مگر جب وہ کچن میں داخل ہوا تو نشفین بھابھی سوں سوں ناک کی ساتھ نم میں الجھی ہوئی تھیں جیسے کسی سے دست بدستہ ہوں۔

"خیریت آج دشمنوں کا موڈ کیوں خراب ہے۔" خود بخود لہجہ شریر ہو گیا آج اسے ساری پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

پرانی باتیں یاد آنا اچھی علامت تو نہیں۔۔۔ اس کے شعور نے اسے ٹوکا مگر آج اسے سب کچھ اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ کوئی بھی بات اداس نہیں کر سکتی تھی چھت کی طوالت چائے کے کپ اور نشفین بھابھی کا چھوڑا ہوا قدم پھر سے لوٹ آیا نشفین اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے پہلے سے زیادہ خفا موڈ میں تھیں

"آخر ہوا کیا ہے آپ کو آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہیں۔۔۔" اس نے انہیں کندھے سے تھام کر پوچھا اور نشفین کی آنکھوں سے آنسو چھلک کر باہر آ گئے وہ کتنی دیر اسے غصے سے دیکھتی رہیں پھر چیخ کر بولیں۔

"آپ نے ابھی میری زندگی عذاب میں ڈال دی۔"

"کیا مطلب نیا کیا ہوا۔۔۔" وہ کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا اور وہ چولہے میں رکھی پتیلی میں مسالا بھونتے ہوئے پہلے سے زیادہ سخت لہجے میں بولیں۔

"طارق باہر رہتے ہیں لیکن صبیحہ تو کراچی میں ہیں نا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے مجھے ستانے آ جاتی ہیں ابھی شارق بھائی کی شادی میں بھی وہ مجھے کسی بھی طرح کا حصہ لینے نہیں دے رہی ہیں کہ یہ حق صرف ان کا ہے پچھلے ماہ طارق نے جو میرے اور بچوں کے لیے کچھ چیزیں بھجوائی تھیں وہ بھی انہوں نے اپنی اور اپنے بچوں کے لیے اٹھا کر رکھ لیں کہتی ہیں وہ ان کا بھائی ہے اس لیے پہلا ان کا حق بنتا ہے۔" وہ منہ کھولے انہیں دیکھتا رہا اس نے تو ایک پلان کے تحت کہا تھا یہاں نشفین کی شادی صبیحہ بجو کے لیے گولڈن ٹائم پیریڈ کی طرح ہے نشفین کی زندگی کے اس رخ کی توقع نہیں تھی۔

وہ سمجھتا تھا وہ طارق کو ایک بار اپنی مٹھی میں کر لیں تو پھر صبیحہ بجو کی کوئی بھی چال کارگر نہیں ہو سکتی مگر یہاں تو گیم الٹ گیا تھا۔

"آپ نے ابھی تک قدم نہیں جمائے میں تو سمجھتا ہوں آٹھ نو سال میں بندہ کسی کی پراپرٹی پر قبضہ کر لے تو اصل مالکوں تک کو زمین چھڑوانی مشکل ہو جاتی ہے یہاں آپ اپنی زمین کو پیروں تلے نہیں جما سکیں۔"

نشفین نے اسے دیکھا پھر روٹھے لہجے میں بولیں۔

"طارق میری قدر کرنے والے ہیں لیکن صبیحہ بھابھی مجھے نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں طارق کہتے ہیں صبر کرو نانی مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ تمہیں پتا ہے کل سے عمیر کتنی مرتبہ ضد کر چکا ہے اپنے نوائے پارسل مانگنے کی میں اب اسے کیا بولوں کچھ کہوں گی تو اماں کو بہت برا لگے گا۔" وہ خاموشی سے کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا پھر سنجیدگی سے بولا تھا۔

"اماں کہاں ہیں۔۔۔" نشفین نے اسے خوف سے دیکھا تھا۔

"پلیز عجبی اماں سے کچھ مت کہنا وہ پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچیں۔"

"ایک منٹ یہ گھبرانا چھوڑ دیں آپ۔۔۔ مجھے ڈری سہمی لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں بے فکر رہیں آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔" وہ کچن سے نکلتا چلا گیا مگر چلتے چلتے یکدم ساری دنیا اس کے سامنے گھوم گئی تھی وہ کتنی دیر تک دیوار پکڑے کھڑا رہا تھا۔ بلڈ پریشر اسے ہمیشہ سے رہتا تھا لیکن کبھی اس طرح شوٹ نہیں کرتا تھا۔ وہ وہیں کھڑا تھا جب اماں اپنے کمرے

گئی تھیں اسے اس طرح گھرا دیکھ کر چونک گئی
تھیں۔ "ہو گئی تمہاری صبح۔۔۔ یہ تو بتاؤ تم رات کو کب
آئے تھے ویسے ابھی تک یہ حق برقرار ہے یا قدم نکلنے
کے بعد ہم تمہاری زندگی سے بالکل نکل گئے ہیں۔"
اس نے اماں کے نقشے کو پہلی بار غور سے دیکھا ہمیشہ
گھر سے بھاگا پھرتا اسے لگتا تھا گھر میں اس کو کوئی
سمجھنے والا نہیں ہے۔ اسے لگتا تھا جتنا وہ سوچتا ہے جتنا علم
رکھتا ہے اور کسی کے پاس نہیں ہے الگ ہو کر سوچنے
کی عادت بری نہیں ہے مگر الگ سوچتے سوچتے سب
سے الگ اور وکھرا سمجھ لینا خود کو یہ اپروچ غلط تھی اور
اسی صحیح اور غلط کے بیچ بٹ کر تنہائی کاٹ رہا تھا۔ آج
اسے اماں بالکل نئی نئی اور بالکل الگ الگ رہی تھیں وہ
قدم قدم ان کے قریب آ گیا تھا پھر کندھوں پہ دباؤ
ڈال کر بولا۔
"کیا ہے اماں کیا میں ابھی تک آپ کا اچھا بچہ نہیں
بن سکا۔" اماں نے چونک کر اسے دیکھا لہجے میں اور
چہرے میں کوئی احساس تھا ضرور جو خود بخود گونج رہا تھا۔
اسے لگا وہ ماضی میں چلا گیا تھا اماں نے اس کے چہرے
کی سنجیدگی سے گھبرا کر اس کو توجہ سے دیکھا پھر یکدم
اس کے اپنے کندھوں پہ رکھے ہاتھوں پر اپنا داہنا ہاتھ
رکھ کر چونک کر بولیں۔
"کیا ہوا ہے؟ تجھے بخار ہو رہا ہے کیا۔۔۔" اس نے
چونک کر دیکھا اس طرح تو شفین بھابھی کو بھی اس نے
مخاطب کیا تھا لیکن انہوں نے بات نوٹ نہیں کی
تھی۔ واقعی یہ سچ ہے ایک ماں ہی اولاد کی سانس سے
اس کے اندر کا موسم جان لیتی ہے۔
"بیٹا تو بخار ہو رہا ہے تجھے۔۔۔" وہ پریشان ہو گئی
تھیں' سو عجیل احمد انہیں صحن میں رکھے تخت پہ
لے جا کر بٹھاتے ہوئے آہستگی سے بولا۔
"کچھ ایسا خاص نہیں ہے۔ کل دوا لے لی تھی مگر
بخار جانے میں کچھ وقت تو لگتا ہے نا۔"
اماں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا غور سے دیکھنے
کی تو تمنا کب سے تھی وہ بھی اور بچوں کی طرح ان
سے فرق نہیں ہوتا تھا آج اسے اپنے وقت سے کتنا
جانے کا یقین ہونے لگا تھا۔
"تیری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں اور چہرہ
بھی کتنا اترا ہوا ہے۔"
اسے ہنسی آنے لگی مگر وہ اماں کے ہاتھوں کو تھام کر
دھیمی آواز میں بولا۔
"کوئی خاص بات نہیں ہے اماں بس تھوڑا سا بلڈ
پریشر رہنے لگا ہے اس لیے کب اچانک شوٹ کر جائے
پتا نہیں چلتا شاید اسی لیے ہی آنکھیں سرخ ہو رہی
ہوں گی۔" اماں نے پیار سے رخسار چھوا تو اسے لگا تمام
تر وکھرے پن کے باوجود اس کے اندر محبت آج بھی
عام سی حالت میں موجود ہے وہی چاہے جانے کی تمنا
وہی توجہ کی ہوک۔ اس نے اب اپنا سر اماں کی گود میں
رکھ دیا تھا پھر آہستگی سے بولا تھا۔
"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کیا واقعی
میں آپ کا اچھا بیٹا نہیں بن سکا ہوں۔"
"پاگل ہوا ہے میرا بیٹا برا کیسے ہو سکتا ہے مجھے تو لگتا
ہے میرا یہ والا بیٹا سب سے اچھا والا بیٹا ہے بس کچھ
جھلا ہے نہ اپنی سمجھ ہے تجھے نہ اپنے دل کی اور اپنے
آپ سے بھاگے پھرتا ہے اتنا سا ہے پر اندر سے کتنا
بہت بڑا ہو گیا ہے۔"
"اماں میں آپ کو اب بھی اتنا سا ہی لگتا ہوں۔۔۔"
اس نے سر اٹھا کر سوال کیا۔ اماں کے چہرے پر الوہی
مسکراہٹ بکھر گئی انہوں نے پہلے کی طرح اس کے
بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں اماں کے نہ
جملے بدلے تھے نہ رویہ بس وہ خود ہی زندگی سے بھاگا پھر
رہا تھا۔
"اپنا خیال رکھا کر چھوڑ دو کھرا پن سب سے گھل مل
کر رہا کر تیری بات ہم لوگ بھلے سمجھنے کے قابل نہ
سہی پر باتیں ہی زندگی نہیں زندگی تو اپنوں سے ہوتی
ہے مجھے پتا ہے تجھے ابھی تک وہ کتابوں والا قصہ نہیں
بھولا ہو گا وہ کتابیں جو تیرے ابا نے ردی میں بیچی
تھیں' پر بیٹا وہ سب تو ایک خوف زدہ باپ کی
کوشش تھی انہیں لگتا تھا کہیں تو بگڑ نہ جائے بس اس

لیے انہوں نے اور میں نے تجھ پر سختی رکھی مگر بیٹا ہم میں سے کوئی تجھ سے نفرت نہیں کرتا۔ تیرے ابا ابھی تک سونے سے پہلے آخری سوال یہی کرتے ہیں میرا عجبی آگیا گھر۔ اور میں ہمیشہ کہتی ہوں نہیں اسے بہت کام ہے وہ ابھی نہیں آیا اور تیرے ابا تیرے آنے کی امید لیے سو جاتے ہیں طارق کا جب فون آتا ہے تیرا پوچھتا ہے شارق جب اور سے لوٹتا ہے سب سے پہلے تیرا ذکر کرتا ہے کہتا ہے اپنا عجبی تو بڑا مشہور ہو گیا ہے۔ اتنا اچھا لکھتا ہے کہ مجھے تو فخر ہوتا ہے اپنے عجبی پر ہمارے گھر سے کوئی تو ماں باپ کے لیے اجر کما رہا ہے صدقہ جاریہ ہوتی ہے ایسی اولاد اماں خوش قسمت ہو آپ وہ ایسا کہتا ہے میرا دل تو خوشی سے بھر جاتا ہے مجھے لگتا ہے میرے دل میں تیری دور رہنے کی خو سے تیری محبت اور بڑھ گئی ہے کتنی بار دل چاہا تجھے اور بچوں کی طرح پیار کروں کبھی تو بھی ان کی طرح میری گود میں سر رکھ کے لاڈ کرے مگر موقع ہی نہیں آنے دیا تو نے۔"

اسے آپ ہی آپ شرمندگی ہونے لگی اندر کی جو تنہائی تھی وہ یکدم سرخوشی سے سوا ہو گئی تھی۔ سو کچھ مزا ایسے میں لطف دو آنے لگیں ــ اس نے موقع دیکھ کر ایک نئے طریقے سے بات چھیڑی تھی اماں کو اس کے سوچنے پر حیرت نے آ لیا تھا۔

"تو گھر میں تو ہوتا نہیں ہے پھر بھی خبر سب رکھتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے شارق کے لیے عائشہ نے رشتہ مانگا ہے۔ مگر میں نے ابھی کچھ ہاں نہیں کی۔ بڑی ویسے بھی شارق کے بعد پہلے تیری کروں گی پھر کہیں شائزہ کی باری آئے گی۔"

اس نے نرمی سے اماں کو دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"میری چھوڑیں اماں! جب مقدر زور کرے گا میری بھی ہو جائے گی اب شائزہ کی بات کریں۔"

صبیحہ کو اس سلسلے میں خبر ہوئی تو خوب وہ اماں سے لڑی جھگڑیں۔

"حد ہو گئی! عائشہ خالہ نے کانوں کان خبر نہیں لگنے دی۔ میں جانتی ہوں بہت چالاک عورت ہیں ان سے میرا سکھ تھوڑی دیکھا جاتا ہو گا۔"

وہ چھٹی کر کے گھر میں تھا سو اس سارے منظر میں کھڑا تھا اور اماں منہ کھولے صبیحہ کو دیکھ رہی تھیں آخر کچھ ساعت بعد انہوں نے کہا تھا۔

"صبیحہ بچے یہ کس لہجے میں بات کرنے لگی ہو بڑوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔" کچھ توقف کیا پھر حیرت سے بولیں۔

"اگر تمہارا رویہ ایسا ہی ہے ان سے تو مجھے حیرت ہوتی ہے انہوں نے میری دوسری بچی کو مانگنے کی ہمت کیسے کر لی ان کا دل تو تم سے ہی اوب گیا ہو گا۔"

"میں جانتی ہوں یہ سب انہوں نے کیوں کیا ہے۔" صبیحہ فوں فوں کرنے لگیں۔ اماں نے رسان سے پوچھا۔

"کیوں کیا ہے بیٹا تم بھی تو اب ـــ"

"سیدھی سی بات ہے اماں تاشی کی یہاں شادی کر کے وہ جس طرح میری مرضی کی غلام ہو گئی تھیں اس کے لیے انہوں نے یہ حل نکالا کہ شائزہ کو لے کر وہ اپنا پلا بھاری رکھنا چاہتی ہیں وہ مجھے دبانا چاہتی ہیں ـــ"

اب اسے بولنا پڑا، ورنہ 'پرخلوص بننے کا ڈرامہ کرنے کے لیے جو باتیں اس نے عائشہ خالہ سے بگھاری تھیں وہ کھل کر سامنے آ جاتیں' شائزہ کچی لکڑی کی طرح تھی کم عمر بچیوں کو آسانی سے اپنے رنگ ڈھنگ میں ڈھالا جا سکتا ہے عائشہ خالہ بے بس تھیں مگر عقل مند تھیں اور اس کا خیال تھا صبیحہ بجو کا زور توڑنے کے لیے یہ ضروری تھا سو کر گزرنا تھا۔ اس نے گلا کھنکھارا تھا پھر مدبرانہ بولا تھا۔

"اماں بجو شروع سے ان لوگوں میں سے ہیں جو ویک پوائنٹ اور تاریک پہلو دیکھتے ہی کو ویکنا سمجھتی ہیں اماں بجو یہ بھی تو سوچ سکتی ہیں کہ شائزہ ان کی بہن ان کے گھر میں بیاہ کر آئے گی تو ان کے دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دینے میں پہل کرے گی کبھی بھی دل کی بات کہنے کے لیے کسی اپنے کی طلب ہوئی تو شائزہ انہیں دستیاب ہو گی۔"

صبیحہ بجو مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگیں

ان کی آنکھوں میں معاملہ واضح ہوتا چلا گیا تھا اسے
لگی تھی اب وہ ٹیم میں پھر سے واپس آ گیا تھا' تاشفین
نے خیال سنا تو تیس ہو گئی تھیں' اس نے بمشکل
انہیں سمجھایا پھر بھی نہیں مانیں تو خفگی سے بولا۔
"اپنے عجبی پر بھروسہ نہیں ہے نہ سہی مگر اپنے
تین بچوں پر تو بھروسہ کرو وہ آپ کے اس گھر میں
ہونے کی سب سے بڑی دلیل ——— ہیں۔ اظفر
بھائی اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ اپنی بیوی کے
حق کی بات نہ کر سکیں۔" انہوں نے ٹھنڈا سانس
لیا۔
پھر آہستگی سے بولیں۔ "مجھے صرف اسی کی فکر ہے
صبیحہ نے انہیں جس طرح ٹرک کر رکھا مجھے ڈر لگتا ہے
اگر شائزہ بھی صبیحہ کے ساتھ چلی گئی تو میری ماں کی جگہ تو
گھر میں کہیں نہیں رہے گی۔"
"تاشی بجو آپ بھی نہ تاریک پہلو کے سوا کچھ
نہیں دیکھتیں۔" وہ لمحے بھر کو رکا پھر اپنا کارنامہ جتانے
لگا تاشفین منہ کھولے اسے دیکھتی رہیں۔
"عجبی تم نے اتنا بڑا رسک لیا میرے لیے تم نے
صبیحہ کا ساتھ نہیں دیا مگر کیا ضروری ہے شائزہ امی کی
خدمت گزار ہو کر رہے۔"
اس نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر نرمی سے بولا۔
"زندگی میں کچھ نیا کرنے کے لیے سیدھی سی بات
ہے تاشی بجو رسک تو لینا ہی پڑتا ہے' امکان ہی میں
زندگی ہے۔ امکان زندگی میں جمود نہیں آنے دیتا پھر
صبیحہ کے مقابلے میں اس کی تربیت کا سارا وقت آپ
کے ساتھ گزرا ہے سو بجو جو عمر ہر بچے کی زندگی میں
کلیدی حیثیت رکھتی ہے بننے بگڑنے' سیکھنے کا سارا
وقت اس کا آپ کے ساتھ بیتا ہے اس لیے آپ کا
رویہ اس میں اتنا رچ بس گیا ہے وہ صبیحہ بجو کی طرح
ری ایکٹ کرنا چاہے بھی تو اس کا اندر بے اطمینانی
محسوس کرے گا لو اندر بن جانے والا رویہ بہت کم
بدلا کرتا ہے آپ فطرت کی طرح کا مارجن دے سکتی
ہیں اسے پھر یہ تو مانتی ہیں امید پر دنیا قائم ہے۔"
تاشفین نے تشکر سے اسے دیکھا پھر طارق بھائی
کے آتے یہ رسم طے کر دی گئی رسم کے دوسرے دن
طارق بھائی نے سب کے گفٹ نکالنے شروع کر
دیے۔
طارق بھائی نے کچھ تحفے خصوصی طور پر تاشفین
کے لیے خریدے تھے میک اپ کٹ سونے کا سیٹ
تین چار جوڑے۔ صبیحہ نے جانتے بوجھتے یکدم سیٹ
کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔
"اماں یہ اپنی شائزہ کی شادی کے لیے رکھ دیں۔"
شائزہ نے بجو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا پھر نرمی سے
بولی۔
"طارق بھائی یہ تاشی بھابی کے لیے لائے ہیں ان کی
پسند پر ان کا ہی حق ہے میری قسمت میں جو ہو گا مجھے
مل جائے گا۔"
وہ جتانے کو مسکرا کر تاشفین کی طرف دیکھنے لگا
صبیحہ بجو کو پتنگے لگ گئے۔ ہمیشہ انہوں نے دوسروں کی
محنت کا پھل کھایا تھا' دوسروں کے لفظوں سے دل رنج
کیے تھے مگر آج وہ بالکل اکیلی کھڑی تھیں الگ سوچنے
والے ہی نہیں صرف اپنے بارے میں سوچنے والے
بھی اکیلے رہ جاتے ہیں مگر صبیحہ بجو آسانی سے ہار ماننے
والی کہاں تھیں بمشکل اسی سوٹ پر ہاتھ رکھ دیا جو

طارق بھائی نے اماں کو دکھانے کے لیے تحفوں میں لا رکھا تھا اور جو صرف ناشفین کے لیے تھا۔

"اماں مجھے یہ رنگ اچھا نہیں لگ رہا میں تو یہ پنک سوٹ ہی لوں گی۔" ناشفین نے طارق کی طرف دیکھا۔ طارق نے اس کی طرف اور یکدم اماں نے کہا۔

"تحفہ تو تحفہ دینے والے کی مرضی کا ہوتا ہے صبیحہ جو بھائی نے دیا ہے وہ رکھ لو یہی اچھی بات ہے۔"

صبیحہ بجو تن فن کرتی وہاں سے اٹھ گئیں اور اس نے تنہا پا کر ناشفین کو دیکھ کر کہا۔

"آپ نے دیکھا میری ذہانت ـــــ" پھر ہنس کے بولا۔

"پہلے مجھے نہیں سمجھ آتا تھا سوچنے والے لوگ ہمیشہ پاگل خانے کیوں آباد کرتے ہیں دنیا میں کوئی پھول کھلانے کا معجزہ ان سے سرزد کیوں نہیں ہوتا' لیکن اپنی زندگی کو دیکھتا ہوں تو سمجھ آتا ہے سوچنے سمجھنے والے لوگ تنہائی کی سزا خود بھوگتے ہیں وہ جو انسان کے بارے میں جاننے کا علم سیکھتے ہیں وہی علم ان کو انسان سے دور کر دیتا ہے۔ زمانے کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں کا فقرہ ہم جیسے لوگوں کے اندر تیزرہ پیدا کر دیتا ہے زمانے کے سینے کی بجائے کسی ایک دل میں دھڑک جانا آسان بھی ہے اور پُر لطف کیفیت بھی سوچنے والے لوگ بہت کم خوش ہوتے ہیں یہ سچ ہے مگر خوش رکھنے کا سبق تو یاد رکھا جا سکتا ہے۔

ہم لوگ بھلے حدف تنقید بنیں لیکن ہم ہی لوگوں کے دم سے تو زمانہ ہے کوئی بھی نظریہ سوچ ہی سے تو پروان چڑھتا ہے پھر کیا ہوا جو ہم لوگ سقراط بنے یا منصور ہوئے' خوابوں کا راستہ ہمیشہ خار زار اور مشکل سے ہو کر گزرتا ہے خواب دیکھنا آسان کام نہیں۔

ہر نیا خواب ایک نیا راستہ ہے اور کسی بھی نئے راستے پر چلنے کے لیے انسان کو پہلے تنہا چلتے رہنا پڑتا ہے۔ چلتے چلتے قافلہ خود بخود بن جایا کرتا ہے۔ انسان خود کو رد کر دے تب دوسروں کو سمجھنے کی پہلی سیڑھی چڑھتا ہے اور بہت کم لوگ یہ نکتہ سمجھتے ہیں میں خود ـــ میں نے بھی تو کتنا وقت ضائع کیا ہے مجھ پر تو انسانوں کا اور اپنے اللہ کا قرض بہت چڑھ گیا ہے کوشش کرتا ہوں اتر جائے دیکھیے کب کامیابی ملتی ہے۔"

"تمہیں کامیابی پانے کے لیے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی تم مانو یا نہ مانو یہ طے ہے تمہیں اللہ نے تمہاری ضد کے باوجود تنہا نہیں کیا تنہا ہونے نہیں دیا' ہر راستے میں تمہاری بات کہنے اور سمجھنے والوں کا جم غفیر لگا کر رکھا بس تم سمجھے دیر سے۔" اس نے سرخوشی چھپا کر کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں واقعی میں دیر سے سمجھا اس کی محبت کو' پہلے میری ضد تھی میں یہ جانوں وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے مگر آج اس کی محبت سے دامن بھرا دیکھتا ہوں تو نظریں چرانی پڑتی ہیں کہ جواباً" اس نے پوچھ لیا اب بتاؤ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو حساب دو تو اپنا حساب تو اوور ـــــ ہو گیا ہے مگر آج سے کوشش کرنے کی تمنا ہے۔"

"بالکل! کوشش زندگی ہے جیسے امکان زندگی اور کبھی کبھی سحر کی امید کرنا خود سحر سے عظیم تر ہو جاتا ہے عجبی ـــــ" ناشفین نے کندھا تھپتھپایا اور وہ وضو کرنے کے خیال سے اپنے کمرے کی سمت بڑھتا چلا گیا اور کوئی تھا جس کا ہاتھ لمس اپنے ہاتھ پر محسوس ہوتا تھا۔

خوابوں کی نگہبانی کرنا آسان نہیں۔
خواب دیکھنا بھی آسان نہیں۔
مگر مشکل راہ تو محبت کی سرشت میں شامل ہے۔
اور ہر مشکل میں اس کا ساتھ راستہ آسان کرنے کے لیے کافی تھا۔

☼ ☼

سعدیہ عزیز آفریدی
محبت دل کا راستہ
"تم جس راستے پر جارہی ہو، کسی منزل پر ختم نہیں ہوتا۔"
آپا نے اس کی تیاری پر تنقید کی تھی لیکن وہ سنی ان سنی کیے لپ گلوس لگا رہی تھی۔
"میں لڑکیوں کی نوکری کے اسی لیے خلاف ہوں۔"
"کیوں آپ نوکری نہیں کرتیں؟ آپ بھی تو ایک آفس میں کلرک ہیں اور آپ بھی میک اپ کر کے جاتی ہیں۔" اس نے ٹون بدل کر سوال داغ دیا۔
"میرا میک اپ ترغیب انگیز نہیں ہوتا۔" ان کے لہجے میں ہلکا سا اپنی ذات کا دفاع تھا اور وہ چڑ پڑی تھی۔
ناولٹ

"تب ہی تو پندرہ سال سے آپ اسی پوسٹ پر ہیں۔ مجھے دیکھیے مہینوں کی کامیابی دنوں میں حاصل کرلی میں اونرکی پرسنل سیکریٹری ہوں۔"

"تم ابھی کم عمر ہو، تمہیں زندگی کی سمجھ نہیں۔" انہوں نے پھر سے کوشش کی لیکن وہ پھر ان سے کوسوں دور تھی۔

"صبا آپا! آپ زندگی کو خود سمجھیں۔ مجھے مت سمجھائیں۔ آپ کو پتا بھی ہے آپ کی عمر 35 برس ہو چکی ہے اور اس عمر میں لڑکیاں اپنے گھر میں رچ بس چکی ہوتی ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے میری نوکری میری ضرورت ہے اگر ابا ٹھیک ہوتے یا ہمارا کوئی بھائی ہوتا تو میں بھی اپنے گھر میں بس چکی ہوتی۔"

"کیا اصل بات یہی ہے صبا آپا؟" وہ سفاکی سے بولی۔

صبا جہانگیر کی آنکھ میں نمی آٹھہری تھی ہمن کی نظروں میں وہ بہت سی خواتین گھوم گئی تھیں جنہوں نے انہیں بڑی عمر اور معمولی صورت ہونے کی وجہ سے مسترد کردیا تھا۔

"کیا تمہیں لگتا ہے' میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھے پسند کرسکے۔"

"یہ سوال آپ کو مجھ سے نہیں آئینہ دیکھتے ہوئے خود سے کرنا چاہیے۔" وہ آج ہر حد پھلانگ گئی تھی کیونکہ وہ چاہتی تھی صبا آپا اس سے قطع تعلق کرلیں' تاکہ وہ ان کی جا و بے جا روک ٹوک سے بچ سکے مگر وہ اپنی تینوں بہنوں سے بہت محبت کرتی تھیں باقی دو ابھی اسکولنگ میں تھیں اور ان کی باتوں کو حرف آخر مانتی تھیں مگر یہ لڑکی۔

"عفی! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔" انہوں نے پھر سے خود کو مجتمع کرکے اس کی طرف پیش قدمی کی اور وہ عجیب سی سرد مہری سے انہیں دیکھتی رہی۔

"ہوئے تم دوست جس کے۔" وہ گنگناتے ہوئے اسکارف پہننے لگی تھی صبا جہانگیر کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

"ناشتہ نہیں کروگی۔؟" انہوں نے بیگ کی طرف اس کے بڑھتے ہاتھ دیکھ کر ماں جیسی ممتا سے پوچھا اور وہ نفی میں سرہلا کر بولی۔

"آپ نے بہت اچھا سا ناشتہ کروا دیا ہے تھینک یو آپا۔" وہ اب سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کی ہر سیڑھی کے ساتھ ان کا دل ایک سانس کم لے رہا تھا۔

"اماں کی زندگی میں ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر تھی کیونکہ وہ اماں کے لیے ایک ڈھارس بھرا کندھا تھیں۔ شوہر اپنی ذمہ داریوں کو نباہ نہیں سکتے تھے۔ نشہ نہیں کرتے تھے مگر انہیں آلکسی اتنی تھی کہ ایک نوکری ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چلتی تھی پھر پڑھے لکھے بھی نہیں تھے یہاں تک کہ کسی فیکٹری' کسی کمپنی میں چوکیدار کی نوکری بھی ملنے کا امکان ختم ہوگیا" تب ان کی ماں نے انہیں اپنا دوست' اپنا بیٹا اور جانے کیا کیا مان لیا تھا اور وہ بھی ان کی زندگی تک اس معیار سے کم ثابت نہیں ہوئی تھیں مگر عفت جہانگیر کی یہ تیز تیز چلنے کی عادت۔ وہ بہت افسردہ ہو کر دونوں بہنوں کو ناشتہ کروانے لگی تھیں پھر ابا کے لیے تھرموس میں چائے اور توس رکھ کر وہ ابا کو جگاتی ہوئی باہر نکل آئی تھیں۔ آج انہیں پانچ منٹ دیر ہوگئی تھی پھر وہ آفس پہنچی تو ان کی آنکھ میں لحہ بھر پہلے والا ڈر اور نمایاں ہوگیا تھا۔ عفت جہانگیر کی ادائیں اور سمیع عرفات کی آنکھوں کی بے حجابی انہیں روح تک سے کپکپانے پر مجبور کررہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عفت جہانگیر نے چائے میں چینی ڈالی تھی اور سمیع عرفات نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"قسم سے عفی! اگر تم چینی نہ بھی ملاؤ تب بھی چائے کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔"

"بس بلاوجہ کی تعریفیں۔" وہ چائے کے کپ کے ساتھ خود بھی اس کے بہت قریب آکر کھڑی ہوگی

تھی۔

"قسم سے کبھی تمہاری تعریف میں نے اوپری دل سے نہیں کی۔ مجھے تمہارا انداز بات کرنے کا ہنر تمہاری بے پر محبت توجہ۔ ہر چیز کشش کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے کاش! تم مجھے پہلے ملی ہوتیں تو میں تم سے ہی شادی کرتا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "مجھ سے شادی کرنے کا اتنا کریز ہے تو اب کرلو۔ مجھے تمہاری پہلی شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"نہیں یار! مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔ تم بغیر شادی کے ہی میرے بہت ناز اٹھا لیتی ہو اور میں چاہتا بھی نہیں ہوں کہ تم عصمہ کی طرح چڑیل بن جاؤ۔"

"اچھا جی وہ چڑیل ہے۔" وہ اور قریب آگئی۔

"ہاں' وہ چڑیل ہے اور تم اپسرا ہو اور میں تمہیں اپسرا ہی کی طرح چاہتا ہوں۔"

"اچھا تو واقعی تم مجھ سے کبھی شادی نہیں کرو گے۔" وہ تھوڑی اور جھکی اور سمیع عرفات کو اپنا سانس بحال کرنا دشوار لگنے لگا۔ دعوت نظارہ دیتا اس کا حسن اس نے اسے قریب کرلیا تھا پھر اس کے بالوں سے الجھ کر بولا تھا۔

"تم میں ہے کوئی بات کہ میں تمام تر انکار کے باوجود اقرار کرنے لگتا ہوں' یہ تیرا حسن جمال جان لے لے گا میری' میری دلہن بنو گی نا عفی۔" اور عفت جہانگیر نے صبا جہانگیر کی تمام سمجھ بوجھ کی باتوں سے منہ موڑ کر کہا تھا۔

"ہاں مجھے تمہاری ہی دلہن بننا ہے' کب لاؤ گے میری بارات۔؟"

"جب تم کہو۔" وہ مسرور ہو کر کہے جاتا یہاں تک کہ اس کے نمبر پر کوئی کال نہ آجاتی یا اس کا سیل فون بجنے نہ لگتا۔

وہ خود کو سنبھالتا اور پھر سے چال باز سمیع عرفات میں ڈھل جاتا اور عفت جہانگیر پھر اپنی چھٹی کے وقت تک ان حسین لمحوں کو' اس کی آنکھوں میں' اس کی باتوں میں ڈھونڈتی رہ جاتی۔

☼ ☼ ☼

"آخر آپ جیسے لوگ دنیا میں آتے ہی کیوں ہیں جن کے اندر زندگی کی امنگ تک ادھار کی طرح مانگی ہوئی لگتی ہے۔" وہ کام کررہے تھے یکدم چونک کر اس ہستی کو دیکھنے لگے تھے جو ان کی بیوی ضرور بنی تھی۔ ساتھی نہیں بن پائی تھی۔

"آپ ایسے گھور کے کیا دیکھ رہے ہیں کیا میں نے غلط کہا ہے؟"

"نہیں صفیہ! تم کبھی غلط نہیں بولتی ہو۔"

"خدا کا شکر ہے۔ آپ نے اعتراف تو کیا؟" صفیہ کے تیور ابھی تک چڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے منمنا کر کہا تھا۔

"میں نے تم سے جھوٹ کب بولا۔"

"ہاں کاش آپ جھوٹ بولنا سیکھ جاتے تو میری زندگی کتنی آسان گزرتی۔" وہ اگلے لمحے اپنی ہی بات کو جھٹلا رہی تھیں' سو انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کپڑے پریس کررہے تھے۔

"آپ کو لگتا ہے۔ میری وجہ سے آپ نے زندگی بہت تکلیف میں گزاری۔"

"لگتا ہے صرف لگتا ہے حمید صاحب! میں نے ایک ایک لمحہ آپ کے ساتھ کسی سزا کی طرح گزارا ہے۔" حمید الدین کی آنکھوں میں یاسیت بھر گئی۔

"میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ آپ کو زندگی کی ہر سہولت دوں۔" انہوں نے بے وقت کہا اور وہ طنزیہ ہنس کر بولی تھیں۔

"یہ زندگی ہے اور یہ زندگی کی سہولت۔ دو کمروں کا گھر' ایک سیکنڈ ہینڈ ٹی وی' فریج اس گھر کی ہر چیز سیکنڈ ہینڈ ہے حمید صاحب۔"

"میں نے ایمان داری سے اپنے عہدے سے وفاداری نبھائی ہے۔"

"ایمان داری! وفاداری! کتنے پرانے لوگوں کی باتیں ہیں مگر آپ کی تربیت ہمیشہ میرے لیے سوہان

روح جی رہی ہے۔ پتا نہیں یہ پرانے لوگ خود مر جاتے ہیں مگر اپنے اعمال کا عذاب دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں دوسروں کی زندگی تباہ کرنے کے لیے۔"

"صفیہ۔" حمید الدین صاحب نے غصے سے پہلی بار آواز اونچی کی تھی۔ صفیہ پر ان کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"جو لوگ کچھ نہیں کر سکتے' وہ بہت تیز آواز میں چیخا کرتے ہیں' جو کر سکتے ہیں ان کا رعب ان کا کام ان کا نام خود بنا دیتا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے میرا معاشرے میں بہت نام اور عزت ہے۔"

"عزت کیا ہوتی ہے حمید صاحب! آپ کے ابا نے یہ گھر نہ بنایا ہوتا تو میں دیکھتی اس دس ہزار کی تنخواہ میں آپ گھر' بچے سب کیسے سنبھال سکتے تھے۔ پتا نہیں میرے ابا نے کیا دیکھا تھا آپ میں۔" وہ تخت پر بیٹھ کر واویلا کرنے لگی تھیں۔

"سب کہتے ہیں۔ آپ دنیا کی خوش قسمت خاتون ہیں' گھر ہے' اچھا شوہر ہے' دو بچے اعلا تعلیم یافتہ ہیں مگر آپ کے دکھ۔"

"دنیا کو نہیں پتا میں کیسے جی رہی ہوں صبح شام کس طرح حسرتیں میرا منہ چڑاتی ہیں' زندگی میں مجھے اچھا کھانا پینا' خوب شاپنگ کرنا پسند تھا۔ آزادی سے گھومنا پھرنا اچھا لگتا تھا مگر گھر میں ابا' اماں کے اصول روک ٹوک اور سفید پوشی کے بھرم زندگی دوبھر تھی۔ جب آپ کا رشتہ آیا۔ پڑھے لکھے تھے۔ ایک کمپنی میں اعلا عہدے پر تھے۔ مجھے لگا میرے سارے خواب شرمندہ تعبیر ہونے کا وقت آگیا مجھے کیا پتا تھا۔ میں اپنے بلیک وارنٹ پر دستخط کر رہی ہوں۔"

"آپ کو مجھ سے اتنی شکایتیں ہیں مگر آپ کی خفگی کو میں اتنا گہرا نہیں سمجھا تھا' مجھے لگا تھا آپ ظاہرا" مجھ سے خفا رہتی ہیں مگر دل میں میرے لیے ایک نرم گوشہ رکھتی ہیں۔"

اب بھی ان کے لہجے میں حسرت تھی کہ وہ کوئی شک کا فائدہ دے کر انہیں اتنی ساری غلطیوں سے باعزت بری کر دیں۔

"آپ کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی آپ نے میرے سارے خواب چھین کر مٹی میں ملا دیے۔ رہی ظاہری خفگی تو' بس مجھے ایک لاوا ہے جو میرے اندر بلبلے بنا رہا ہے اچھال پیدا کر رہا ہے۔ مگر یہ لاوا اس لیے پھٹنے نہیں پاتا کہ میرا گھر قائم رہے' بچوں میں آپ کا بھرم قائم رہے۔"

"میرا بھرم؟!" وہ خالی الذہنی سے اٹھے تھے پھر نہا کر نکلے تو چھوٹے بیٹے کو ماں سے لاڈ کرتے پایا "اماں بس دو ہزار کی تو بات ہے یونیورسٹی کے سب لڑکے جا رہے ہیں ٹور پر۔"

"مگر تم ان لڑکوں جیسے نہیں ہو۔ کیونکہ ان کے لیے وہ ہزار دو روپے جیسے ہیں اور تمہارے لیے دو ہزار دو لاکھ جتنے۔"

"پتا نہیں ابا کو اتنا ایمان داری کا بھوت کیوں سوار ہے؟"

"فضول مت بولو' وہ تمہارے ابا ہیں۔"

"جانتا ہوں۔ کاش ایسے ابا مجھے نہ ملے ہوتے۔ بندہ کوئی خواہش ہی نہیں کر سکتا' ایک تمنا دل میں چٹکی کاٹتی ہے' دوسرے پل اپنے ارد گرد کو دیکھ کر واپس حقیقت میں آنا پڑتا ہے۔" وہ باہر کھڑے ہوئے سنتے رہے۔

"مجھ سے نہیں رہا جاتا اتنا کلس کلس کر ایسی زندگی صرف آپ اور بھیا کو پسند ہوگی مجھے نہیں میں موقع کی تلاش میں ہوں جہاں داؤ لگا میں تو اس گھر سے نکل جاؤں گا۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے افضل؟" صفیہ نے غصہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

اور وہ سر جھٹک کے بولا۔ "میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے اسے آپ تینوں کی طرح حالات کے آگے سر جھکانے کی بیماری نہیں لگی۔"

وہ ساکت سنتے رہے پھر خاموشی سے تیار ہو کر اپنے

دفتر کے لیے نکل گئے بہت سے سوال کھڑے چھوڑ گئے بہت سے سوال اپنے ساتھ اٹھائے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے ایک بار پھر سے پارہ دیکھا تھا۔

"آپ کہنا چاہتے ہیں میرے گردے۔"

"جی ہاں آپ کو ڈائی لیسز کروانا پڑے گی ورنہ آپ کے لیے بہت دقت ہو جائے گی زندگی کی قدر کیجیے مسٹر سلمان۔"

اور وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئے پھر چلتے ہوئے قدموں نے ساتھ نہیں دیا تھا وہ ایک گارڈ کی بینچ پر بیٹھ گئے تھے "زندگی۔"

حسرت کی طرح انہوں نے بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھا اور سوچا ان کا زندگی سے تعارف کیسا ہوا تھا۔ وہ شاید چودہ برس کے تھے جب زندگی نے تلخی کی طرح ان کی عمر کے دروازے پر دستک دی تھی۔ ان کے سر پر باپ نام کا جو سایہ تھا وہ یکدم اچانک چھین لیا گیا تھا۔ اچھے بھلے ابا جب اپنی دوکان پر گئے تھے تو انہیں گمان نہیں تھا کہ زندگی ایک دم سے یوٹرن لے گی "ڈکیتی کی واردات میں مزاحمت پر ڈاکوؤں نے ابا کو گولی مار دی تھی وہ اسکول سے بلائے گئے تھے اور تب وہ پہلا لمحہ تھا جب انہوں نے موت کو باقاعدہ اپنے سامنے ساکت لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔

"سلمان! تمہارے ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے خالی ہو جانے والی اماں کو دیکھا۔

ابا کا اور ان کا ساتھ تو بس اور دھڑکن کا تھا۔ وہ ان کے عم زاد تھے اور ظالم سماج ان کے بیچ کہیں سے نہیں آیا تھا۔ دونوں نے بہت آسانی سے ایک دوسرے کو پالیا تھا اور آج۔؟؟

آج اس سے بھی آسانی سے کھو دیا تھا۔ کتنے سارے خواب ان بند آنکھوں میں یک بارگی ابھر کر آخری سانس کی طرح ڈوب گئے تھے۔

پھر انہوں نے دو بہنوں اور تین بھائیوں کو ایک ایک کر کے گنا اور کئی کئی سال خود کو بڑا ہوتے ہوئے پایا پھر زندگی میں خود ان کے لیے اپنی کوئی جگہ نہیں بچی تھی، وہ بس اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں لگے رہے تھے، اپنی خواہش اور تمنائیں سینت سینت کر رکھتے گئے تھے کہ جب وہ سہولت سے جینے کا سوچیں گے تو ساری تمنائیں یک بارگی ایک سانس ہی میں جی لیں گے اور اب پندرہ سال بعد وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طور پر پورا ہونے کا جشن بھی منا نہیں سکے تھے۔ ایک بہت زبردست ٹھوکر لگی تھی۔

"مجھے ابھی نہیں مرنا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہے میرا، جس سے میں نے وعدہ نہیں کیا کوئی خواب نہیں دکھائے مگر وہ جانتی ہے کہ اگر میں زندگی میں کسی کے ساتھ جینا چاہوں گا تو وہ صرف وہ ہی ہے۔ ماہ نور جمال ان کی ہر اداسی ہر مایوسی کے لمحات میں امید کا روپ دھارنے والی زندگی سے بھرپور ایک لڑکی جسے ان کی اماں نے خوش خوش ان کے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ ان کی محبت کو دیکھ کر ان کی بہنوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ مل کر اس خوشی کو سیلیبریٹ کیا تھا اور اب اچانک یہ رپورٹیں ان کی دشمن ہو گئی تھیں وہ بہت مایوس تھے جب بالکل اچانک ان کے سیل فون پر ماہ نور کی کال آئی۔

"ہیلو ماہ نور۔" ان کی آواز ان کے دل کی ناامیدی سے لرزیدہ پائی تھی تب ہی دوسری طرف بیٹھی ماہ نور کی جان نکل گئی تھی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کی آواز کیسی ہو رہی ہے آپ نے تو آج ہسپتال جانا تھا اپنی رپورٹس لے کر پھر۔"

"نور! میں گیا تھا ڈاکٹر اجمل کے پاس۔" وہ رونے لگے۔ پھر بولے پھر آہستگی سے سمجھانے لگے۔ "ہم ہار گئے ہیں نور! ایک کڈنی بالکل فیل ہے اور ایک پچاس فیصد کارکردگی دکھا رہی ہے اب تم ہی بتاؤ میں تمہیں کن خوابوں میں زندہ رکھوں میں تو خود۔"

"کچھ نہیں ہوا آپ کو اور اگر ہوا بھی ہے تو ہر بیماری کا علاج ہے بس آپ ناامید نہیں ہوں۔"

"امید کے لیے کون سا روزن کھلا رہ گیا ہے نور؟"

"یہ روزن جب تک ایک بھی سانس باقی رہتی ہے، زندگی کی امید کو مرنے نہیں دینا چاہیے۔ انسان ایک بار ہی مرتا ہے ایک بار ہی جیتا ہے۔ سو ہم موت اور زندگی کے بیچ کا یہ وقت ناامیدی کی نذر کیوں کریں۔"

"مگر نور! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا، میری ساری زندگی ذمہ داریوں میں چلی گئی ہمیں اب کچھ جینا چاہتا تھا اپنے لیے اور ایک دم سے زندگی نے کہا حساب ختم ہوا۔"

"سلمان! آپ سوچیں اگر یہ سب دس سال پہلے ہوا ہوتا تو آپ کی اماں یہ ذمہ داریاں کیسے اٹھا پاتیں وقت نے آپ کا کتنا ساتھ دیا ہے۔ آپ کو ہمت سنبھال کر رکھا اور اب اگر کچھ تکلیف دی ہے تو بھی آپ کے گرد کتنی محبتیں ہیں، جو آپ کا حوصلہ ہیں۔ آپ کی ہمت ہیں۔ آپ کے ساتھ میں ہوں سلمان! اور میرا اور آپ کا ساتھ صرف زندگی تک کا نہیں ہے۔"

سلمان احمد کی نمی میں ہلکی سی ہنسی شامل ہوئی تھی۔

"تھینکس سلمان سائنس کہتی ہے بیماری اتنی بڑی یا خطرناک نہیں ہوتی جتنا ہماری سوچ ہماری طرز زندگی، ہماری مایوسی اسے خطرناک مقام پر لے جاکر کھڑا کر دیتی ہے، لوگ کینسر جیسے سفاک مرض سے بھی لڑتے ہیں جیتتے نہیں ہیں تو بھی طویل تر ماہ و سال چھین کر جی لیتے ہیں اور زندگی مکمل ہے اگر اس میں کوئی آپ کا دل سے ہے۔ آپ کو کسی بھی حالت میں تنہا چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، سمجھ رہے ہیں نا آپ؟"

"ہاں۔ تم واقعی میری ہمت میرا حوصلہ ہو نور!"

"اور آپ میرے لیے زندگی کا دوسرا نام ہیں سلمان" اس کی آواز میں محبت ہی محبت تھی۔

"اچھا میں اب چلتا ہوں۔" انہوں نے آسودگی سے کہا تھا۔

"کہاں جائیں گے؟"

"گھر جاؤں گا۔ اماں کو بھی تھوڑا بریف کرنا ہے اپنی بیماری کے بارے۔"

"تو کے میں اماں کے ساتھ گھر آؤں گی آج رات"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

انہوں نے سیل آف کیا اور اپنے گھر کی سمت جانے والی بس کے روٹ پر چلنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر انٹرویو کیوں دیا اسفندیار؟" یکدم بہت غصیلی آواز اس کے قریب گونجی اور اس کی کمپیوٹر پر تھرکتی انگلیاں یکدم رک گئیں۔

"ماما! میں نے پاپا سے پوچھ لیا تھا۔" اس نے رسان سے کہا۔

"کیا تم صرف اپنے پاپا کے بیٹے ہو؟ میرا تم پر کوئی حق نہیں؟" ماما کا غصہ پہلے سے سوا ہو گیا تھا اور وہ کمپیوٹر آف کر کے متوجہ ہوا۔

"آپ کو آخر میرے فوج میں جانے پر کیا اعتراض ہے ماما؟"

"مجھے نہیں پتا لیکن میں اتنا جانتی ہوں۔ تم فوج میں نہیں جاؤ گے۔ تم اپنی فیملی کی طرح بزنس مین بنو گے۔"

"مگر میرا انٹرسٹ نہیں ہے بزنس میں۔ مجھے بچپن سے آرمڈ آفیسرز پسند ہیں۔"

"کیا تمہارے لیے صرف تمہاری پسند اور مرضی ہی اہم ہے۔" وہ سخت خفا تھیں۔

تب اس نے ولار سے ماما کو کندھوں سے تھام لیا تھا۔ آپ صرف اس لیے ڈرتی ہیں کہ کسی محاذ پر آپ کا بیٹا مر نہ جائے۔" لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔

"مگر ماما! موت کا ایک دن معین ہے، جب موت کا

وقت آگیا تو بزنس میں ہونا میری ڈھال نہیں بنے گا۔ مجھے اتنا ہی وقت ملے گا زندہ رہنے کا۔"

"وہ تمہیں بتا ہے۔ فوج میں سیاست کا کتنا عمل دخل بڑھ گیا ہے اور اس وجہ سے فوج کی عزت بھی مجروح ہوئی ہے۔"

"ہاں مگر میں صرف اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوج میں جانا چاہتا ہوں مجھے اقتدار اور زمینوں کی ہوس نہیں۔"

"صرف تم ہی کیوں اور بھی لوگ ہیں وہ فوج میں کیوں نہیں جاسکتے۔"

وہ ہنس پڑا۔ "اگر سب کی مائیں یہی سوچتی رہیں تو ہماری فوج جو ویسے ہی عددی برتری میں کم ہے صرف زیرو رہ جائے۔ کیا پہاڑوں اور گاؤں والوں کا فرض ہے اس ملک کے لیے اناج پیدا کریں اور حفاظت کرنے کے لیے فوجی بھی پیدا کریں۔ مارکول کی سڑکوں پر چلنے والے امریکن طرز زندگی گزارنے والے بہت اچھا بہت برا یا نسیتاً درمیانہ طرز زندگی جینے والوں کا کوئی فرض نہیں بنتا ہم صرف اس بات کا زعم کب تک کرتے رہیں گے کہ ہم ملک کی اکانومی کو صفر سے ہزار تک لے جارہے ہیں تو ہم ہر چیز سے بالاتر ہیں۔"

"تم فوج میں نہیں جاؤ گے۔"

"اس مہینے کی پندرہ تک ٹیسٹ کے لیے جانا ہے ماما۔"

"تو تم نہیں جاؤ گے۔" وہ غصے سے چلائی تھیں۔

"آپ کیا چاہتی ہیں ماما پلیز کوشش کریں آپ دل سے میرے اس فیصلے کو مان لیں اور پھر سردست عارف بھائی ہیں نا پاپا کا بزنس سنبھالنے کے لیے۔"

"تم نے شہرین کو بتایا ہے اپنے اس فیصلے کا۔"

انہوں نے آخری امید کا نام لیا وہ ان کی بھانجی تھی اور فوج میں بھرتی ہونے کے سخت مخالف۔

"جی میں نے اسے کل بتایا تھا۔ وہ بھی آپ کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہے۔"

"اور تم پھر بھی اپنی مرضی کرنا چاہتے ہو۔"

"جی ماما! کیونکہ میں جانتا ہوں میں غلط نہیں ہوں۔"

اس نے ان کی طرف سے پشت کر لی تھی۔ ماما اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ جب اچانک اس نے کل کی اپنی اور شہرین کی ملاقات کو یاد کیا تھا۔ اس نے ابھی اطلاع دی ہی تھی کہ بڑی بڑی ستارہ آنکھیں غصے سے اس پر تم گئی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ نہیں رکھا اس فیلڈ میں۔"

"میں حب الوطنی کے جذبے سے جارہا ہوں شہرین! کوئی بزنس کرنے نہیں جارہا میرے لیے یہ فیلڈ نہیں زندگی کو ٹھیک طرح سے جینے کا ایک راستہ ہے۔"

"میں نے ایک میسج بھیجا تھا آپ کو کیا نہیں پڑھا تھا۔" اس نے جتائی لی تھی تکلیف بھری یکدم اسے وہ میسج یاد آگیا تھا۔ "ایک فوجی کی ڈائری کا صفحہ۔ وہ اسے جھٹلنا چاہتا تھا کہ شہرین اسے پھر سے سنانے لگی تھی۔

"میری عمر کے بہت سے نوجوان کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہوں گے مگر میں یہاں محاذ پر ہوں جہاں کوئی بھی گولی میری زندگی ختم کردے گی اور یہ زندگی میں ان لوگوں کے لیے ختم ہوتے دیکھوں گا۔ جنہیں سنگر اور بڑی ملک کے اداکاروں کو دیکھنا ان فوجیوں کی کہانی سننے سے زیادہ ضروری لگتا ہے۔ جو صرف ان کے لیے اپنی جان کی بازی لگاتے ہیں تاکہ وہ سکون سے سو سکیں۔"

"بس ہو چکا۔" وہ چپ ہوئی تو اسفندیار نے خفگی سے کہا۔

"تو تمہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟"

"پہلی بات تو یہ ہے اگر میں ایک لمحے کے لیے یہ مان بھی لوں کہ ایک فوجی انسان ہے مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ کوئی فوجی جو واقعی میں فوجی ہے اپنے کسی فیصلے پر پشیمان نہیں ہو سکتا ہے وہ غازی شہید دونوں حالتوں

میں خود کو دنیا کے لیے اپنے دین اور اپنے وطن کے لیے داؤ پر لگاتا ہے اور جو چیزیں شو آف نہیں ہوں ان میں پچھتاوا اور پشیمانی کا عنصر بھی نہیں آتا جب ایک فوجی اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کرتا ہے تو اسے اللہ ہی سے توقع ہوتی ہے اس کے بندوں سے نہیں۔ اس پیرے کا آخری حصہ تو اس میں، میں کہہ سکتا ہوں یہ ہماری واقعی کمزوری ہے، ہم ان کی خدمت کا اتنا حق ادا نہیں کرپاتے جتنا کرنا چاہیے۔"

"اور ینگ مین! کیا سوچ رہے ہو۔" کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ یکدم ہوش میں لوٹ آیا، اس کے سامنے عارف بھائی کھڑے تھے۔

"ارے، آج آپ اتنی جلدی کیسے آگئے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"بس ایسے ہی مستقبل کے آرمی آفیسر کے ساتھ چائے پینے کا دل چاہ رہا تھا۔" اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں خفگی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

"آپ میرے اس فیصلے سے خفا تو نہیں ماما کی طرح۔"

"نہیں مجھے کیا اعتراض ہوگا میرے بھائی! یہ تو خوش نصیبی ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمیں یہ سعادت مل رہی ہے ماما اور نائلہ سخت خلاف ہیں مگر میں نے انہیں بھی یہی کہا ہے کہ فوج میں جانا کوئی برائی نہیں رہا موت کا ڈر تو اس کا ایک دن مقرر ہے۔ ماما نے کچھ کہا تو نہیں مگر مجھے لگتا ہے وہ اب بھی دل سے راضی نہیں ہیں اور شاید تمہیں سمجھانے کی ایک اور نشست رکھیں گی۔"

"ہم... وہ یہ معرکہ لڑ کر جا چکی ہیں بڑے بھیا۔"

"تم پریشان مت ہو، میں، سرمد اور پاپا تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تھینکس بھائی۔"

"پاگل ابھی سے غیریت دکھا رہا ہے۔" وہ ہنس پڑے۔

"نہیں تو بھائی۔" وہ شرمندہ ہوا اور وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "یہ سوری تو پھر بھی اچھا لگتا ہے، کبھی کبھی رشتوں کو باہم جوڑے رکھنے کے لیے مگر یہ تھینک یو مجھے نرا تکلف بھرا انداز لگتا ہے اپنوں میں تو محبت کے بدلے بس محبت چلتی ہے شکریہ غیروں میں اچھا لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔" وہ ان کے ساتھ اٹھا تھا پھر ان کے کمرے میں نائلہ بھابھی چائے بنا کر لائی تھیں اور وہ عارف بھائی کی الماری کھولے کھڑا تھا۔

عارف بیڈ پر بیٹھے لیپ ٹاپ پر کسی کام میں مصروف ہوگئے تھے۔

"چائے۔" عارف بھائی مسکرائے اور چھوٹی ٹیبل کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"چائے اتنی بدمزا تو مت کرو یار۔" وہ ہنس کر بولے پھر لمحہ بھر کو رکے اور اس کی طرف مڑے۔

"اسفند کیا ڈھونڈ رہے ہو الماری میں۔"

"سرمد بھائی نے کہا تھا آپ پرسوں چار شرٹس لائے ہیں بڑی کلاسی سی۔ وہ دیکھ رہا تھا۔"

"ارے وہ۔ وہ دوسرے حصے میں نائلہ نے استری کرکے ہینگ کررکھی ہیں۔"

اس نے دوسرا پٹ بھی کھول لیا تھا پھر وائٹ اور میرون شرٹ کے ہینگر اٹھائے تھے۔

"یہ مجھے اچھی لگ رہی ہیں بڑے بھیا! یہ میں لے رہا ہوں۔"

نائلہ نے خفگی سے دیکھا اور وہ مسکرادیے۔ "لے لو اسفند! میں اور لے آؤں گا۔"

"او کے میری پاکٹ منی میں سے کاٹ لیجیے گا۔" اس نے ہینگر بیڈ پر رکھ کر چائے اٹھائی اور عارف ہنس پڑے پاپا کے ساتھ ساتھ سرمد بھائی سے بھی وہ اچھا خاصا جیب خرچ لیتا تھا اور اس وقت اسی جیب خرچ کی بابت بات کررہا تھا۔

"چل بکواس نہ کر سب تیرا ہی تو ہے۔"

"جیو میرے بھیا۔" وہ چائے پی کر شرٹس لے کر نیچے چلا گیا تھا پھر یہ دوسرا دن تھا جب اس نے سنا پاپا ماما سے کہہ رہے تھے۔

"تم بلاوجہ خفا ہو رہی ہو، ورنہ اگر ملکی سیاست میں دیکھو تو بزنس مین آرمڈ آفیسر آپ کی پاور کو بیلنس رکھتا ہے میں تو سوچ رہا تھا کاش میرا ایک اور بیٹا ہوتا تو میں اسے وکالت کرواتا پھر وہ جسٹس بنتا پھر تم دیکھتیں کیا راج ہوتے تمہارے ہماری ہائی سوسائٹی میں جس کے جتنے کانٹیکٹ ہوں وہ اتنا ہی ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ تمہارا بیٹا آرمی آفیسر بن گیا تو تمہاری حیثیت ان سب عورتوں میں زبردست ہو جائے گی بیگم۔"

ماما کی آنکھوں نے سوچنے کا موڈ بنایا اس لگژری اس حیثیت کا اعداد و شمار نکالنا شروع کیا اور اسے ہلکا سا غصہ آگیا، پاپا یہ کیا نئی سنا رہے تھے وہ تو صرف حب الوطنی سے سرشار تھا اور پاپا اس جذبے کو آلودہ کر رہے تھے اس نے کمرے کے اندر داخل ہونے کے لیے پہلا قدم رکھا، پاپا کا چہرہ اس کی طرف تھا اور انہوں نے واضح اسے ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا پھر پندرہ منٹ بعد وہ اس کے پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"تمہاری ماں جس طرح کا دماغ رکھتی ہے اس میں ہمیشہ وہ ہی خیال سیڑھی چڑھ سکتا ہے۔ جس کا ریٹرن اس سے بہتر نکلے جیسا وہ خیال تھا اور ہر عورت حیثیت شناخت اور شان کی کسی حد تک پرورہ ہوتی ہے۔ کچھ عورتیں اسے [illegible] ہیں کچھ اسے قطعی اگنور کر دیتی ہیں تاکہ وہ ذرا [illegible] میں آسکیں مگر میری سہولت یہ رہی کہ تمہاری ماما اس کا برملا اظہار کرتی ہیں سو مجھے انہیں دل سے راضی کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔"

وہ تھوڑا سا مسکرایا تو پاپا نے اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اسفندیار! میں تمہیں اپنے وطن کو عطیہ کر رہا ہوں کیونکہ جو میں اسے دے رہا ہوں اس نے اس سے کہیں زیادہ مجھے دیا ہے۔"

ان کی آواز شدت جذبات سے بھاری ہو گئی تھی اسفندیار آگے بڑھ کر پاپا کے سینے سے لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

میں جب صحافت میں داخل ہوا تو مرے ذہن میں دور دور تک سچ کا علم بلند کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا ہمیں صرف اسے ایک نوکری کے سوا کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ جو مجھے ایک اچھی بیلنس شیٹ بنانے میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ میرے خواب میری تنخواہ سے بھی بہت بڑے تھے۔ اس لیے میں نے لفافہ کلچر کو سر جھکا کر سلام کیا تھا اور یوں میرے راستے کھلتے چلے گئے اور آج میں اپنے ہی اخبار کے ایک نیوز چینل میں ایک پروگرام ہوسٹ کر رہا ہوں، میرا پروگرام "سچ بیانیاں" بہت تیزی سے مقبولیت کے گراف بنا رہا ہے۔ [illegible] اور بات کہ یہ سچ بیانیاں صرف ان لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ جو من کے سچے اور تھوڑے کچے ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں ہوتی ہیں، جن سے میری ڈیل فائنل نہیں ہو پاتی یا وہ مجھے ہلکا لیتے ہیں سو پھر ان کے آن دی ریکارڈ بخیے ادھیڑنے کا مزہ ہی الگ ہے پھر وہ سیاسی لوگ بھی ہو سکتے ہیں، بزنس کمیونٹی سے بھی، خود میری اپنی فیلڈ کے لوگ بھی سب لوگ مجھے چلتا پھرتا بم سمجھتے ہیں اور اس اہمیت کی قدر میرا دل خوب کرتا ہے۔

وہ لکھتے لکھتے ایک فون بیل پر چونکا تھا۔

"ہیلو صبا آپا خیریت۔" وہ لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔

"کیا ہوا عفی! نے پھر کوئی ہلنگامہ کر دیا ہے۔"

"وہ تو پاگل ہو گئی ہے، تم جانتے ہو نا سمیع عرفات کو۔"

"جی ایک نمبر کا ٹھرکی ہے۔"

"وہ عفی اس سے محبت کرنے لگی ہے۔"

اور محبت کا لفظ آتے ہی وہ زور سے ہنس پڑا۔ "چھوڑیں صبا آپا آپ اینجل فرشتہ ہو سکتی ہیں مگر میں اور عفی کبھی اینجل نہیں ہو سکتے اور شیطان کبھی محبت نہیں کرتا اگر محبت کا مزہ شیطان نے چکھا ہوتا تو

کبھی مردود نہ ہوتا آپا' مجھے پتا ہے' عفی صرف سمیع عرفات کی دولت ہتھیانے کے لیے یہ محبت کا ڈرامہ کررہی ہے۔ سوری آپا! میری زبان ذرا تلخ ہوگئی ہے مگر آپ جانتی ہیں نا میں اپنی اور اس کی کارکردگی پر اسی طرح تعریت کرسکتا ہوں۔"

"تم کچھ کرو۔"

"آپ بے فکر رہیں وہ خود کچھ ایسا کرے گا کہ عفی روتے ہوئے آپ سے آکر معافی مانگے گی۔ اپنی غلطی کی اور جو تیکھے مزاج کے بچے ہوتے ہیں نا۔" وہ روتے ہوئے بہت پیارے لگتے ہیں۔"

"تیری باتیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

وہ ہنس پڑا تھا پھر آہستگی سے بولا تھا۔ "شکر کریں آپ کو میری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ورنہ آپ اتنی ذہین ہیں کہ میری جگہ لے چکی ہوتیں۔" رکا پھر مدھم بولا۔

"آپ ذہین ہیں اور میں کمینگی کی حد تک چالاک۔ اس لیے آپ کے میرے اسکیل میں فرق ہے آپ تو جانتی ہیں نا یہاں جو قابل ہے وہ ملازم اور جو چالاک ہے وہ حاکم اعلا' یہاں عہدے ملتے نہیں خریدے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے میں اپنی بیلنس شیٹ میں زیرو لگاتا جارہا ہوں مستقبل میں بھی ایک ٹرسٹ بنانے اور کسی آفیشلی عہدے تک جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اپنے ماضی کو وائٹ کالر کرسکوں اور ٹرسٹ میرے سارے گناہوں کو دھوسکے۔"

"تم کتنا سوچتے ہو نا فرخ احمد۔"

"بس صبا آپا اسی کی تو کھاتا ہوں۔" وہ رکا اور نرمی سے بولا۔

"آپ عفی کی فکر مت کیا کریں بس سمجھیے وہ میری ذمہ داری ہے۔"

"فرخ احمد۔" صبا آپا کی آواز میں واضح لرزش تھی۔

"آپ جو سمجھی ہیں ٹھیک سمجھی ہیں میں بچپن سے جانتا ہوں۔ ایک شیطان کے ساتھ ایک شیطان ہی چل سکتا ہے' رہی اماں کی نخریلی طبیعت تو اس طرف سے بھی فکر نہ کریں اچھا خاصا فائدہ مند ہوں ان کے لیے' وہ مجھے کسی بھی صورت میں لوز نہیں کرنا چاہیں گی۔"

"ایسا نہیں کہتے خالہ جان تم سے بہت محبت کرتی ہیں فرخ۔"

"وہ آپ کی خالہ جان سہی مگر میری امی جان ہیں اس لیے میں جانتا ہوں ان کی محبت کی حقیقت۔"

"بہت بدتمیز بچے ہو تم۔" صبا آپا نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

اور وہ ہنس پڑا "بس کبھی غور نہیں کیا۔" پھر وہ فون رکھ کر اپنا آرٹیکل مکمل کرنے لگا اور وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس وقت مگن ہو کر کام میں مصروف تھا کہ اچانک ایک فون بیل پر وہ چونکا پھر یہ فون کئی دن تک آتا رہا یہاں تک کہ آج وہ اس فون کال سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگیا تھا۔ کافی نئی خبریں تھیں اس کے پاس وہ خود کو کمپوز نہیں کرپارہا تھا کہ اچانک عفت جہانگیر آگئی تو اس نے اپنی ہر پریشانی کو خود سے جھٹک دیا تھا مگر عفت جہانگیر چالاک تھی فوراً بھانپ گئی۔

"کیا ہوا ہے' آپ آج بہت پریشان لگ رہے ہیں۔"

"نہیں کچھ خاص نہیں۔ بس ایک فون کال تھی کوئی مجھے بلیک میل کررہا تھا' پتا نہیں اتنی خفیہ معلومات اسے کیسے ہوگئیں؟"

"آج کل دنیا بہت تیزی سے دائیں سے بائیں ہورہی ہے سمیع! ہماری نیٹ' میں کی گئی باتیں' فون' سیل فون ہر طرح کی باتیں چھلنی میں سے گزر کر ہم تک آتی ہیں تو جو لوگ ان معاملات سے متعلق ہوتے ہیں وہ کسی کی بھی معلومات کو اچھی قیمت پر بیچ دیتے ہیں ہاں بس اس کی قیمت آپ کے پبلک فیگر ہونے سے بڑھتی گرتی رہتی ہے اور آپ تو اچھے خاصے مشہور انسان ہیں بزنس مین ہیں اسکالر بھی۔"

"ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے مگر فکر مت کرو میں ہینڈل کرلوں گا اسے" اور جب وہ یہ کہہ رہا تھا تب اچانک اس کے آفس کے ڈور پر دستک ہوئی تھی۔

"کم ان۔" سمیع عرفات نے ناگواری سے کہا تھا کیونکہ وہ ابھی کچھ وقت عفت جہانگیر کی کمپنی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور کسی آنے والے نے یہ پلان ناکام بنادیا تھا پھر دروازہ کھلا تھا اور سمیع عرفات کی سانسیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔

آنے والی ایک عدد لڑکی تھی جس نے تنگ موری کی چست جینز اور بہت چھوٹا بلاؤز پہن رکھا تھا۔

"یہ پاکستان ہے محترمہ!" عفت جہانگیر نے سمیع عرفات سے بھی پہلے کہا اور وہ لڑکی اس بات پہ گھبرا گئی۔ سمیع عرفات کے چہرے پر اب ناگواری تھی۔

"عفت! آپ میرے لیے کافی بنا کر لائیے۔"

عفت جہانگیر پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی اور جب وہ کافی بنا کر واپس لوٹی تب تک اس کے پیروں سے زمین کھینچی جاچکی تھی۔ وہ لڑکی سمیع عرفات کے بہت قریب بیٹھی تھی۔

"یہ ایلی ہے۔ آج سے میری پرسنل سیکریٹری ہے۔" اس کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔

"یہ انگلش میں ایم اے ہے۔ فارن ڈیلی گیشن کے سامنے میرے لیے زیادہ اچھے طریقے سے کمپنی کرسکے گی۔"

کھڑے کھڑے اس نے اس کی کم تعلیمی قابلیت کو جتادیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے مگر اس نے پھر بھی اپنے آنسو بہنے نہیں دیے تھے جہانگیر نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا مگر وہ واش روم کی طرف بڑھتی چلی گئی تھی' باقی ٹائم اس نے نارمل گزارا تھا۔

بہت سارے دن اسی طرح بے کیف گزرے تھے اپنی انسلٹ برداشت کرکے اپنی جگہ بناتے ہوئے مگر آج اتنے دن کی کاوش پر وہ پوری طرح سمیع عرفات کو ہار گئی تھی۔ اس نے لنچ ساتھ کرنے کو کہا تھا اور وہ ایلی کو ساتھ لے کر باہر چلا گیا تھا۔ اس کی فرمائش پر۔

اتنے دنوں کے سارے آنسو جو۔ تنہائی میں تکیہ بھگونے سے بچ گئے تھے پھر سے آنکھوں میں بھر آئے تھے' آج وہ آفس ٹائمنگ سے پہلے اٹھ گئی تھی مگر آج صبا آپا نے بینک سے ہو کر آنے کا کہا تھا وہ سیدھی گھر پہنچی تھی۔ ابا نے حیرت سے دیکھا تھا۔ چھوٹی بہنوں نے بھی آج اس کی جلدی آمد کا نوٹس لیا تھا مگر وہ کسی سے بھی کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

پھر کافی دیر بعد اس نے تنہائی سے تنگ آکر کسی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو بچپن سے اس کا دوست تھا مگر جس سے کبھی اس کی دوستی نہیں ہوئی تھی مگر جس سے وہ بہت ساری باتیں شیئر کرلیتی تھی۔

"بولو عفی جی! آواز میں اتنا دکھ کیوں ہے؟"

اور وہ کچھ بولنے کے بجائے رونے لگی تھی۔ وہ کافی دیر تک تو اس کی ہچکیوں' سسکیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر چڑ کے بولا۔

"یہ رونا دھونا معصوم لوگوں پر اچھا لگتا ہے تجھ جیسے اور مجھ جیسے لوگ روتے ہیں نا تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے کیونکہ ہم جیسے لوگوں کو جو تکلیف ملتی ہے ہماری ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ملتی ہے اس لیے ہمیں رونا سوٹ نہیں کرتا۔"

"تم ایسے کیوں ہو؟" وہ چڑ گئی تھی۔

اور وہ ہنس کے بولا تھا۔ اس لیے کہ میں کبھی خود ترسی کا شکار نہیں ہوتا غلطی کرتا ہوں تو اسے مانتا ہوں اس غلطی پر مظلومیت کی' معصومیت کی گل کاری کرکے خود کو بھولا نہیں ثابت کرتا۔"

"تم بہت سفاک ہو۔" وہ چیخی تھی اور وہ نرمی سے بولا تھا۔

"نانا۔ غصہ نہیں کرو' یہ بتاؤ ایسی افتاد کیا ٹوٹی ہے کہ تم جیسی لڑکی رونے لگی۔"

"بکواس مت کرو۔ آپا نے تمہیں سمیع عرفات کا تو بتایا ہوگا۔"

"مجھے تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ کہیں کیا ہوا اس

کو؟"

"میں مان ہی نہیں سکتی کہ آپا جو تم سے ہر بات ڈسکس کرتی ہیں یہ بات نہیں ڈسکس کریں گی۔"

"اچھا بابا۔ہاں کی تھی انہوں نے یہ بات مجھ سے۔ میں نے کہا تھا پریشان مت ہو' لوٹ کے بدھو گھر کو ہی آئیں گے۔"

"تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو۔" وہ چونکی تھی اور اس نے اسی اطمینان سے کہا تھا۔

"ظاہر ہے وہ اپنی بزنس کمیونٹی میں ایک نمبر کا ٹھرکی مشہور ہے تو ایسے بندے سے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ جلد کسی اور کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوجائے گا۔"

"مگر میرا دل۔" وہ تڑپی تھی تو وہ ہنس کر بولا تھا۔

"چل رہن دے میرے ساتھ یہ دل کی بات نہ کیا کر تو بھی جانتی ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ ہمیں کبھی کسی سے محبت نہیں ہوسکتی۔ ہم دونوں فائدہ اور نقصان کی طرف بھاگنے والے عام سے لوگ ہیں محبت تو بڑا اعلا درجہ ہے زندگی کا۔"

وہ کچھ نہیں بولی تھی 'کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور وہ اس کی خاموشی کو محسوس کرکے بولا۔

"صبا آپا کی کمی محسوس کررہی ہو نا۔ مجھے پتا ہے ایسے معرکے کے بعد دل کو ممتا بھری گود یاد آتی ہے۔ میری ماں کو تو یہ لفظ چھو کر بھی نہیں گزرا مگر صبا آپا ہیں نا۔ جب آئیں تو ان کی گود میں سر رکھ کر خوب رونا' معافی مانگنا اور پھر کبھی ان سے اختلاف مت کرنا کیونکہ میں نہیں چاہتا میری بیوی میری ماں جیسی بڑی بہن کی نافرمانی کرے۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔؟" وہ یکدم بدک گئی تھی۔

"ہاں میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تو ہی ہے زندگی گزارنے کا صحیح جوڑ۔"

"مجھے اتنی بدتمیزی سے بات کرنے والے آدمی سے رشتہ نہیں جوڑنا۔"

وہ رونکھی ہوکر بولی تھی اور وہ ہنس پڑا تھا۔

"دیکھو ایم اے جرنلزم ہوں۔ انگلش میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ پر خاص دوستوں سے ایسی گفتگو میں جو مزہ ہے' وہ کہیں اور نہیں۔ رہا رومانٹک بھرے ڈائیلاگ تو تم جانتی ہو' میں کتنا سفاکی کی حد تک صاف گو ہوں۔"

وہ چپ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا' تب اس نے فون بند کردیا تھا۔ زبردستی مگر دو گھنٹے بعد تک جو صبا آپا گھر نہ پہنچیں اور کئی ہیلوز پر بھی وہ اپنا سیل فون نہ اٹھا رہی تھیں تو اس نے پھر فرخ احمد کو فون کیا تھا۔

"اچھا میں جارہا ہوں اسی طرف ایک کام ہے۔ صبا آپا کے بینک کا چکر بھی لگالوں گا۔"

اس نے جواباً" کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آدھے گھنٹے بعد وہ صبا آپا کے سامنے تھا' دروازہ واچ مین نے ہی کھولا تھا مگر اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کے ساتھ چپکے کھڑے شخص کی سین میں ناموزونیت۔ وہ چونکا پر اندر داخل ہوگیا عملہ سراسیمہ سا تھا۔

"صبا آپا! آج اتنی دیر کیوں ہوگئی آپ کو تنخواہ نکلوانے میں۔ کتنی بار کہا ہے اے ٹی ایم کارڈ لے لیں مگر آپ بھی نا۔"

صبا آپا کا چہرہ ہونق سا ہوگیا۔ ایک لمحے میں اس کی سمجھ میں آگیا کہ بینک لوٹا جارہا تھا اور وہ غلطی سے اس ہنگامے کا حصہ بن گیا تھا۔

"جی مام! آپ کا اکاؤنٹ ٹرانسفر کروادیا ہے۔ جی ابھی مینیجر کے کمرے سے نکلا ہوں بس بیس منٹ میں گھر ہوں گا۔" مگر جب اس سے سیل فون چھنا تب اس کو علم ہوا وہ بینک میں محصور ہوچکا ہے۔ وہ اسفندیار جو آرڈ کور میں شامل ہونے کا خواہش مند تھا۔

"چپ کرکے بیٹھ جاؤ۔ ادھر کسی نے چوں بھی کی تو جان سے ماردوں گا۔"

اس نے پوری طرح سے جائزہ لیا ایک بہت خوش شکل سا شخص بیٹھا تھا مگر وہ بہت اداس لگ رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کے وجیہہ شخص تھے۔ ایک خاتون تھیں

اور ایک بہت تیز نظر آنے والا خوبرو لڑکا تھا اس وقت بینک میں بہت رش نہیں ہوتا تھا اکا دکا لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لیے ہجوم کے بجائے چند لوگوں کا قابو کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

وہ صبا آپا سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اور اس کے بائیں طرف وہی نوجوان بیٹھا تھا جس کے ہاتھ سے سیل فون چھینا گیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔"

"اسفندیار ولی..."

"باچا خان سے تعلق ہے۔؟" وہ ہنسا تھا۔

"نہیں میرے پاپا معروف بزنس مین ولی افضل ہیں۔"

"آہستہ بولو تمہارے متعلق پتا چل گیا تو بینک ڈکیتی کے ساتھ تمہیں اغوا برائے تاوان میں اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"میں کسی پرابلم سے نہیں ڈرتا۔"

"یعنی ابھی تمہارا زندگی سے تعارف پوری طرح نہیں ہوا۔ گھر میں سب سے چھوٹے لگتے ہو۔"

اسفندیار کچھ نہیں بولا۔

"کسی نے پولیس کو اطلاع دی ؟" فرخ احمد نے اسفندیار سے پوچھا اور اسی لمحے اسی خوبرو شخص نے آہستگی سے اس کے کان میں جھک کر کہا۔

"انہوں نے سب سے پہلے پولیس الارم کو کٹ کیا ہے سارے فونز ٹیپ پر منتقل کردیے ہیں اور سارے سی سی ٹی وی کیمروں کے تار توڑ دیے ہیں۔"

"اتنی مہارت سے ہوا ہے کام کہ کوئی کچھ نہیں کرسکا میں جب منیجر کے کمرے میں اے سی دوسری بینک میں ٹرانسفر کروا رہا تھا تو منیجر کافی پراسرار لگ رہا تھا مگر صوفے پر بیٹھا ہوا شخص ڈاکو تھا مجھے اس کا دور دور تک وہم گمان نہیں تھا اچھا خاصا کھاتے پیتے گھرانے کا شخص لگ رہا تھا۔"

"ہم بھی نا ڈاکو اب پرانے گیٹ اپ پر نہیں چلتے۔ اب ایسے ہی اچھے نین نقش کے لوگ ڈاکو ہوتے ہیں۔" اس نے اسفندیار کی ناسمجھی پر مسکراہٹ سمیت جملہ اچھالا۔

"تم دونوں بہت باتیں کررہے ہو ابھی میں تمہاری ہنسی ختم کرواتا ہوں۔"

ایک ڈاکو نے اسفندیار اور فرخ احمد کو چھوڑ کر سلمان پر دھاوا بولا۔

"پلیز مجھے مت ماریں۔ میں بیمار آدمی ہوں۔" وہ ایک ہی ہاتھ پر بلبلا اٹھا تھا۔

"ہمیں بھی بیماری ہے مارنے کی۔" دوسرے نے بھی ہاتھ چلا دیا اور فرخ احمد نے کوٹ کی جیب میں رکھے نمبر پر A SAVD نام کو مہارت سے کال ملا دی۔ یہ مہارت اسے رپورٹنگ کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ کچھ لمحے پہلے اس کے اندر حب الوطنی کے جیسے کسی جذبے نے سر ابھارا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے چینل کے نیوز ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کو کال ملا دی تھی۔

"کون ہے؟"

"اسفند! یہ بینک XZ کی کون سی برانچ ہے۔"

اسفند نے برانچ بتائی اور وہ بڑبڑایا۔ "پتا نہیں آخر کب تک ہمیں یہاں محصور رہنا پڑے گا۔"

"بریکنگ نیوز پر ڈالو XZ برانچ میں ڈکیتی 5 افراد ہوسٹیج...."

"میں نے پولیس کو فون کردیا ہے۔ پانچ منٹ میں وہاں نفری پہنچنے والی ہے۔" کسی اور شخص نے اطلاع دی اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ نے اسے شاباش دی۔

"گڈ! جلدی سے نیوز الرٹ کرو، خبر کو بریک تھرو ہم دیں گے کہ ابتدائی شام کے وقت میں کیسے ڈکیتی ہو رہی ہے؟"

"تھانے کے انچارج کا نام بھی ڈال دینا بہت ایمانداری کے راگ الاپتا ہے اپنے بارے میں۔" پورے نیوز روم میں افراتفری مچ گئی تھی۔

"آپ کو لگتا ہے سر! ہم کچھ غلط نہیں کرنے جارہے۔" احمد ظفر کے جونیئر نے اس کی طرف سوال اٹھایا۔

"کیونکہ تمہیں یہ غلط کیوں لگ رہا ہے؟" اس نے

ابرو ترچھے کر کے اسے دیکھا اور اس نے نرمی سے کہا۔

"ابھی جو کچھ تھا عارضی طور پر یرغمال تھے وہ سب۔ لیکن میڈیا اور پولیس کی شمولیت سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے مر اگر کسی کی جان چلی گئی تو....."

"تو کیا حکومت ہے نا ایک 'دو لاکھ انعام دے ہی دے گی' چیک باؤنس ہو جائے تب بھی حکومت بہت حد تک وائٹ کالر رہے گی' پھر اگر یہ کوئی اور خبر بریک کرتا تو کیا وہ یہ سب کچھ سوچتا' پھر میں کیوں سوچوں اپنے کیریئر کے لیے کوئی تہلکہ خیز خبر چاہیے۔"

خبر بریک ہو چکی تھی اور سب اپنے اپنے گھروں کے مختلف ماحول اور کلاس کے باوجود ایک ہی طرح کی سراسیمگی میں آ گئے تھے' ہاں مگر ان کرداروں سے جڑے لوگ سب سے زیادہ ہراساں ہو گئے تھے۔ عفت جہانگیر فون کر رہی تھی' مگر فرخ احمد کا نمبر بزی جا رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے تمہاری بہن تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔" آج ہی تو فرخ احمد نے اس کے دماغ کی اوور ہالنگ کی تھی۔ "میری اگر ایسی کوئی بہن ہوتی تو شاید میں ایسا نہیں ہوتا جیسا اب ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے اماں! صرف اسی بچے کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھیں' جوان کے لیے گھر کے لیے' بہت اچھا معاون و مددگار ثابت ہوتا تھا' پہلے میں نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی' مگر پھر جب یہ کلیہ سمجھ میں آیا' محبت کا تو میں نے بس پیسہ ہی کمانے کو ضروری سمجھا' پھر کبھی پلٹ کر محبت کے جذبے کو نہیں چکھا' سوائے صبا آپا کے میرے لیے محبت اور کہیں نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے صبا آپا کی منگنی کتنے عرصے رہی تھی؟"

"منگنی وہ بھی صبا آپا کی؟ کب؟ مجھے تو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔" وہ حیران ہوئی تھی۔

"جب تم دوسری میں پڑھتی تھیں تب ہوئی تھی صبا آپا کی منگنی۔ مگر انکل کی گھر کی طرف سے بے توجہی اور خالہ جان کی ناگہانی موت نے انہیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔ اظفر بھائی سات سال تک ان کا انتظار کر کے اپنا گھر بسانے پر مجبور ہوئے تھے۔ کوئی کرتا ہے ایسا عفت! اگر تم اپنی بہن کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ایک پل میں جا کر سانس بھی لے لو نا تو تمہارا دم گھٹ جائے گا اور اپنے گھر' اپنے جیون ساتھی کے خیال سے مہکتے ایسے ہزاروں پل انہوں نے لاکھوں دنوں میں سمیٹ کر زندگی کو خالی لوٹائے ہیں۔"

"وہ آ جائیں گی تو میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔"

"اور مجھ سے کیا مانگو گی؟ ابھی سے بتا دو' تاکہ ساتھ لیتا آؤں صبا آپا کو۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے غصہ دکھایا تھا اور اس نے کہا تھا۔

"آج کچھ مت پکانا' کیونکہ آج تم جو کھانا پکاؤ گی نمکین ہی ہوگا' تمہارے رونے دھونے کی وجہ سے۔" وہ رکا اور پھر بولا۔

"میں کھانا ریسٹورنٹ سے لے آؤں گا.... اچھا اب بند کرتا ہوں سگنل کھل گیا ہے۔"

یہ فون اس نے گھر کے راستے میں کیا تھا' کہا تھا اور اب وہ خود کتنا تنہا محسوس کر رہی تھی صرف وہ ہی جانتی تھی۔ ابا نے پہلی بار باپ کی محبت سے صبا آپا کے لیے ہاتھ پھیلا کر دعا کی تھی' ورنہ تو وہ بس ان کے لیے کھانے پینے اور سگریٹ کی فراہمی کے ایک ذریعے کے علاوہ کچھ نہیں تھیں۔ دونوں چھوٹی بہنیں رو رو کر پریشان ہو رہی تھیں۔ فرخ احمد کا پتا چلا تو خالہ کا پورا گھرانہ بھی ان کے گھر آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے آج سے پہلے پتا ہی نہیں تھا کہ حمید الدین کی اہمیت میرے لیے سر پر گھنے سائے دار درخت کی طرح ہے۔ ایک عورت دنیا فتح کر لے' مگر وہ اپنے شوہر کے ہونے سے ہی ایک معتبر حوالہ بنتی ہے اور میں ہمیشہ اس بات سے بھاگتی اور اس خیال کو ٹھکراتی آ رہی تھی' دو جوان بچوں کی ماں ہونے کی اتراہٹ مجھے پیر زمین پر رکھنے نہیں دیتی تھی' میں' گھر اور بچے جس وجود کا انعکاس تھے میں نے اسے ہمیشہ گھر میں کسی اجنبی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ دونوں بچوں کے اندر میں نے

کبھی اپنے شوہر کی محبت کی مٹھاس نہیں ڈالی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ دونوں بچے ہمیشہ اپنے باپ سے ایک مخصوص فاصلے پر رہے۔ میں نے بیوی کی حیثیت سے انہیں زندگی میں لڑائی جھگڑے اور تنہائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ لیکن ایسا ممکن ہے۔ میں وقت کو واپس لوٹا سکوں اور اپنی ساری غلطیوں‘ اپنی ساری نادانیوں کو ایک محبت کے احساس سے مٹا سکوں‘ شریک کا ساتھ عمر کی آدھی دوپہر میں زیادہ ضروری اور زیادہ مٹھاس بھرا احساس بن جاتا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکی۔ مجھے پتا ہے کفران نعمت کرنے والے ہمیشہ ایسے ہی راندہ درگاہ رہتے ہیں۔ مگر اک خوش گمانی ہے کہ شاید شرف قبولیت اور توبہ کا در ابھی کھلا ہو۔"

صفیہ جائے نماز پر بیٹھی تھیں اور حمید الدین صاحب کا چھوٹا بیٹا خیبر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"مجھے آج سے پہلے پتا ہی نہیں چلا تھا گن پوائنٹ پر رکھی دوسری طرف کھڑے شخص کی جان کتنی ضروری ہے‘ میں نے تو صرف شارٹ کٹ مارا تھا۔ تھرل اور اپنی پاکٹ منی کو اضافی طور پر سہارا دینے کے لیے اسٹریٹ کرائم کا پرزہ بنا تھا۔ مگر یہ آج کیا ہوا تھا۔ اس کا یہ عمل اس کی طرف لوٹا دیا گیا تھا۔ نیک لوگوں کی طرح اس کے عمل بد کا پورا پورا حساب کھول دیا گیا تھا۔ وہ بے قرار پھر رہا تھا‘ پھر یک دم صفیہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا تھا۔

"اللہ کہتا ہے جو گناہ جس نے کیا اس کا عذاب بھی اسے ملے گا‘ ہم ابا کو کیوں محصور ہونا پڑا‘ اگر آج بابا کو کچھ ہوا تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔"

صفیہ بیگم سمجھ بھی نہیں پائیں اور وہ ہسٹریائی انداز میں اپنی سرگرمیوں کی بابت بولتا چلا گیا۔

"صفیہ! تم نے اپنی راہ خود کھوٹی کی‘ اگر نیکی کے راستے پر چلنے میں پہل کرنے کی عادت ڈالی ہوتی تو میرا یہ بچہ اس جرم کی دنیا میں قدم نہیں دھرتا۔"

"بابا کو کچھ نہیں ہو گا۔ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تم نے برائی کو برائی مان لیا ہے تو توبہ بھی کر لو‘ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جی بھیا! میں آپ کے سامنے قسم کھا کر کہتا ہوں‘ اللہ جی کے کسی بندے کو ناحق نہیں ستاؤں گا۔ بس میرے بابا کو وہ واپس کر دیں۔"

"بس فکر نہ کرو‘ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں میڈیا اور پولیس سے رابطے میں ہوں۔ ابھی تک پولیس نے کارروائی نہیں شروع کی ہے۔ صرف بات چیت سے معاملہ حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

وہ آنسو صاف کرنے لگا تھا۔ آج اسے لگا تھا‘ ایک واقعہ کیسے زندگی بدل سکتا ہے‘ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس ایک واقعہ نے کتنے لوگوں کی سوچ کا زاویہ بدل دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے نہیں معلوم آپ کس سے بات کریں۔ مجھے میرا اسفندیار چاہیے۔"

"اسے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ اللہ کی راہ میں نکلی ہوئی روح ہے۔ اس کی حفاظت اللہ بہتر طور پر کرے گا۔"

"مجھے نہیں پتا۔ آپ کا ہو گا اتنا صبر‘ مگر مجھے میرا بیٹا چاہیے۔ بس ہو گیا فیصلہ‘ وہ فوج میں نہیں جائے گا۔"

"ابھی جو کچھ ہوا‘ وہ فوج میں ہونے کی وجہ سے ہوا ہے؟ وہ ایک عام شہری ہے اس وقت‘ مگر دیکھو ڈیمو سے اللہ تعالیٰ تمہیں بتانا چاہتے ہیں کہ وہ جب چاہیں زندگی کو دائیں سے بائیں‘ اوپر سے نیچے کر سکتے ہیں‘ اس نقطے کو سمجھو۔"

ماما یک دم کسی چابی کے کھلونے کی طرح رک گئی تھیں۔ "کیا واقعی یہ میرا امتحان ہے یا میرے صبر کو تقویت دینے کا ایک بہانہ‘ کیا چاہتا ہے اللہ مجھ سے۔"

"جو لوگ اپنی جان‘ اپنا مال‘ سب اس اللہ کو سونپ دیتے ہیں وہ کبھی مایوس ہو کر نہیں مرتے بیٹا! اللہ ان کی بہتر خبرگیری کرتا ہے۔ ان کے دکھ میں ان کو دلاسا دیتا ہے۔ جیسے ایک ماں اپنے دکھی اور آزردہ بچے کو دلاسے سے سمیٹ لیتی ہے‘ تم بھی اس کا دامن تھامو‘ اس سے کبھی مایوس ہو کر نہیں پلٹو گی۔"

یہ ان کے ابی کے جملے تھے جو اچانک اس حالت جانکاہ میں اندر سے نکل کر دل کے اندر مکالمہ کرنے لگے تھے۔

"میڈیا تک خبر کیسے پہنچی؟ یہ باوثوق ذرائع کون ہے؟" ان کے لیڈر نے پولیس کے سائرن سننے کے باوجود اطمینان سے پوچھا تھا۔ فرخ احمد نے بہت خاموشی سے اپنے آفس کارڈ کو ڈسٹ بن کی نذر کیا تھا۔ مگر اسی وقت اسی سوال کرتے شخص کا موبائل بجا تھا۔ وہ سنتا رہا تھا اور بہت تفصیل سے سن کر غصے سے پھنکار کر بولا تھا۔

"تم میں سے فرخ احمد کون ہے؟ اس کے چینل نے یہ خبر سب سے پہلے بریک کی ہے اور اتنی مہارت کے بعد 'یہ کیسے ہوا' ہم پہلے صرف ڈکیتی کے بعد چلے جاتے 'مگر اب اس فنکار کو سات سلام کرنا ہم پر فرض ہو چکا ہے۔" اس نے آفس کے سارے عملے کو داخلی دروازے کی سمت بنی ہوئی انتظار گاہ میں جمع کر دیا تھا۔

"سارے بلائنڈز ہٹا دو' تاکہ پولیس کو پتا چلے کہ اگر اس نے کوئی کارروائی کی تو یہاں کوئی نہیں بچے گا۔" فرخ احمد نے گنا۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ پورے چھ افراد تھے۔ باہر کھڑا واچ مین کو لے کر اندر آگیا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے لوڈڈ۔"

"ہم اگر کوئی کارروائی کریں تو ہم پندرہ افراد ہیں' پھر بھی فگر میں ان سے زیادہ ہیں۔" اسفند یار نے کان میں گھس کر کہا اور وہ موقعے کے باوجود اسے گھور کے رہ گیا۔

"افراد پندرہ سہی' مگر ہر ریوالور میں چھ گولیاں ہیں اور بندے سات۔"

"گولیاں ختم نہیں ہوں گی۔ ہم ختم ہو جائیں گے۔"

"جو ڈر گیا' وہ مر گیا۔"

"ہاہا.... میں نے بھی دیکھی تھی یہ فلم' ایک دم بکواس تھی تمہارے آئیڈیے کی طرح۔"

"میں نے پوچھا ہے۔ تم میں سے فرخ احمد کون ہے؟"

صبا آپا نے سر جھکا لیا تھا کہ ان کی نظر کا زاویہ اس کے لیے پرابلم نہ کھڑی کر دے۔ مگر انہیں حیرت ہوئی تھی جب فرخ احمد کے ساتھ کھڑا نوجوان ایک نہیں دو نہیں پورے سات قدم آگے کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں ہوں فرخ احمد! بولو کیا کرو گے؟" اس نے اس کی طرف ریوالور تان لیا تھا۔

"ایک کو مارنے کی سزا بھی موت اور پندرہ کو مارنے کی سزا بھی موت.... مگر میں تمہیں ماروں گا نہیں۔ تمہیں اپنے لیے استعمال کروں گا ہم رقم سمیت یہاں سے زندہ جائیں گے۔"

"خوش خیالی ہے تمہاری۔" اسفند یار نے نڈر ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا۔ فرخ احمد کے دل کو اچانک کچھ ہوا تھا۔

"کیا زندگی صرف پیسہ ہے؟ صرف نام نمود اور شہرت؟ اگر آج میں ان لوگوں کے ساتھ مرجاتا ہوں تو میرا نیوز چینل مجھ پر سیاست ضرور کرے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی بینیفٹ بھی دلوا دے حکومت سے' مگر کیا وہ میرے نامۂ اعمال میں ایک ناکام اور کرپٹ انسان کی شہرت کو آب زم زم سے دھو سکے گا؟ میں اپنے ساتھ کیا لے کر چل رہا ہوں؟ خالی ہاتھ' صرف خالی ہاتھ۔"

وہ یک دم ہراساں ہو گیا تھا۔

"یہ لڑکا! اسے کوئی ڈر نہیں ہے' اسے پتا نہیں کیا چیز ہے' جو اتنا نڈر بنا رہی ہے۔ اسے کس کا آسرا ہے؟ کس بات کا یقین ہے۔"

"تم نہیں جانتے ہو' مگر مجھے اپنی جان کبھی بھی اپنے اصولوں سے زیادہ پیاری نہیں رہی ہے۔

میں وردی کے بغیر بھی ایک مجاہد ہوں اور وردی کے ساتھ تو میرے عزائم موت سے بھی شکست نہیں کھا سکتے' کیونکہ ہم جان کی بازی ہار بھی جائیں تو بہت سی آنکھیں ان خوابوں کو اپنے اندر جگہ دے کر ان کی تکمیل میں آگے بڑھ جاتی ہیں۔"

"خالی پیلی بھاشن...." سامنے کھڑے شخص نے پوری قوت سے تھپڑ مارا تھا۔ وہ ہلا تھا' مگر اسی مضبوطی سے ایستادہ تھا۔

اور کونے میں سمٹے بیٹھے سلمان احمد نے سوچا تھا۔ "ماہ نور نے ان کے اندر کتنی توجہ' کتنی چاہت سے'

محبت کا کتنا اعتماد ڈالا تھا۔ زندگی ساتھ ساتھ گزارنے کے خواب پروئے تھے۔ مگر آج سے پہلے وہ لفظ اس طرح سے اثر انداز نہیں ہو پائے تھے۔

زندگی کی [illegible] موت کے دہانے پر پہنچنے سے پہلے واقعی کبھی نہیں [illegible] سے بڑی بیماری سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر دل میں زندہ رہنے کی امنگ اور مقابلہ کرنے کی مزاحمت کرنے کی لگن ہو۔ رہی تو موت، موت تو بہت اچانک کبھی بھی کسی بھی لمحے وارد ہو سکتی ہے۔ جیسے کہ آج... کیا آج وہ اپنی بیماری سے مرنے والے تھے یا ایک حادثاتی لمحے کی وجہ سے۔

"کاش مجھے بہت سارا وقت ملتا اور میں اپنی ماہ نور، اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارتا۔" انہوں نے دل سے دعا کی تھی۔

پولیس پوزیشن لے چکی تھی اور اعلان کر رہی تھی سب یرغمالیوں کو باحفاظت چھوڑ دیا جائے تو ان کے ساتھ نرمی کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

اس کے باس نے تھانے کے انچارج کو فون کیا تھا، جسے میڈیا کے نمائندے نے تیز آواز میں نشر کیا تھا۔

"ہمیں ایک گاڑی فل پیٹرول کے اور محفوظ راستہ دیا جائے، ورنہ سارے عملہ اور ان شہریوں کو مار دیا جائے گا۔"

"تم میڈیا کو بولو، ہمارا ساتھ دیں۔" ڈاکوؤں کے لیڈر نے اسفندیار کو موبائل دیا تھا اور وہ نڈر انداز میں بولا تھا۔ "آپ کو جھکنے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری فکر مت کریں، ان کاؤنٹر کریں سب کا۔"

آدھا جملہ [illegible] ہوا تھا۔ [illegible] سارا بینک میں گونج کر رہ گیا تھا اور گینگ لیڈر نے اسفندیار کو نیچے گرا لیا تھا۔

"تمہارا ان کاؤنٹر کرے گا" ہمارا؟" ریوالور کا رخ بالکل اس کی طرف تھا۔ باقی لوگ الگ الگ جگہ پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے۔ بینک کے پچھلے دروازے سے لے کر ایسی ہر جگہ کو کور کر لیا گیا تھا کہ جہاں سے کارروائی کی امید کی جا سکتی تھی۔ مین بینک کی انتظار گاہ میں صرف تین افراد پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔

فرخ احمد نے تیزی سے سوچا تھا [illegible] گلدان اٹھا کر اسفندیار کو کور کیے شخص کے سر پر مارا تھا۔ اسفندیار نے سامنے لگی پینٹنگ کے گلاس پر فرخ احمد کا عکس دیکھ کر جوابی ہی چھلانگ ایکشن لیا اور اسے بچا گئی تھی۔ کیونکہ گلدان لگنے سے اس کے سر میں ٹریگر پر دباؤ پڑا تھا اور گولی برآمد ہوئی تھی۔ گولی بینک کے فرش پر لگی تھی۔ اسفندیار نے مجرم کو موقع نہیں دیا تھا۔ اور اپنے کنگ فو کے جوہر دکھا کر چھپانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوا تھا۔

"آپ سب کاؤنٹر کے پیچھے جائیں۔" واچ مین اور فرخ احمد نے مورچہ سنبھال لیا تھا۔ باقی دونوں مجرموں نے فائرنگ کی تھی۔ مگر کیونکہ وہ یہ کارروائی گھبراہٹ میں کر رہے تھے۔ اس لیے وہ اس سچویشن کو سنبھال نہیں پا رہے تھے اور اس سے پہلے [illegible] جگہوں پر مورچے سنبھالے افراد یہاں [illegible] تیزی سے کچھ کرتا تھا۔ فرخ احمد اور اسفندیار نے ایک ساتھ گلدان کو اٹھا کر گلاس وال پر کھینچ کر مارا تھا۔ ان میں سے کسی کی بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر جب اسی مقام پر دوبارہ دوسرا گلدان پھینکا گیا ڈاکو ہنس پڑا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے وہ تمہارے ہوتے ہوئے یہاں اسٹریٹ فائر کریں گے۔"

"نہیں، مگر وہ عقل مند ہوئے تو میری بات اچھی

طرح سمجھ جائیں گے۔"

وہ خود نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مگر جب اسموک بم اندر آنے لگے تو وہ مطمئن ہو گیا' پورا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا تھا اور یہ چند منٹ بہت اہم تھے۔ گلاس ڈور توڑا جا چکا تھا اور دوسرے مورچوں پر فائرنگ کے منتظر اور مزاحمت کرتے ہوئے سارے ڈاکو مقابلے کے بعد گرفتار کیے جا چکے تھے۔

"مسٹر فرخ احمد! یہ سب آپ کی کمال بہادری ہے۔ ورنہ یہ معاملہ نمٹانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ میں ان افراد کو "سیف وے" دینے کا آرڈر کرنے ہی والا تھا' مجھے حکم تھا انہیں راستے میں مار گرانے کی کوشش کی جائے' انہیں جو گاڑی دی جانی تھی' اس میں ٹریکر سسٹم آن تھا' مگر سر! آپ واقعی کمال ہیں۔"

"ہاں' مگر یہ سب اس نوجوان کی وجہ سے ہے' جس نے آج میری سمت درست کی۔ مجھے خالی ہاتھ مر جانے سے بچالیا۔"

"جی سر! میں سمجھا نہیں سر؟" آفیسر نے کم فہمی سے دیکھا اور وہ مسکرایا۔ "آپ سب کچھ سمجھنے لگے تو ہمارا کام کیسے چلے گا سر۔"

"جی!" آفیسر جا چکا تھا۔

کسی نے اسفندیار کو گلے سے لگایا تھا۔ "تم فوج میں ہی جاؤ گے' بس فیصلہ ہو گیا آج۔"

"سچ مام!" اسفندیار نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں زندگی کو جیسا تم جینا چاہتے ہو جیو۔"

وہ ان کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ مسٹر حمید الدین تھکے ہوئے قدموں سے چل رہے تھے' جب ان کے سیل پر زینب بیگم کی کال آئی تھی۔

"خدا کا شکر ہے' آپ ٹھیک ہیں حمید! مجھے آج احساس ہوا ہے۔ آپ میرے لیے کتنے اہم اور ضروری ہیں۔"

"ماما! ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پاپا آپ واقعی ہماری زندگی کا ڈائنمو ہیں' سب کچھ آپ کے دم سے ہے۔"

"پاپا آئی لو یو۔" کوئی بہت قریب سے پکارا تھا۔ انہوں نے دیکھا۔ یہ ان کا بڑا بیٹا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور زندگی میں پہلی بار محبت کو اثر پذیر ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

اور ایک سائیڈ پر سلمان تھے۔ ماہ نور سے کہہ رہے تھے۔ "زندگی کی قدر موت کی قربت کے احساس سے پہلے کبھی نہیں ہو پاتی۔ مجھے تمہارے ساتھ بہت سارا جینا ہے ماہ۔"

"مجھے بھی آپ کے ساتھ بہت سارا جینا ہے سلمان۔" اور فرخ احمد گاڑی میں بیٹھا صبا آپا کی پروا کیے بغیر بولا تھا۔ "آرہا ہوں تمہاری تمام تر بددعاؤں کے باوجود زندہ بچ کر اور ہاں تمہاری آپا بھی ساتھ ہیں۔ سنو' استقبال ذرا شاندار کرنا۔ آخر کو تمہارا ہونے والا مجازی خدا ہوں۔"

دوسری طرف کچھ نہیں کہا گیا۔ شرمگیں ہنسی کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔ فرخ احمد فون بند کر چکا تھا اور صبا آپا نے پوچھا تھا۔ "اتنا بڑا چینج کیسے آگیا؟"

"بس آپ کا حکم تھا' سو ہوم ورک مکمل کر کے پلان کیا اور بی ایک ساتھ شروع کیا تھا۔ مجھے پتا تھا وہ ٹھرکی آدمی ہے۔ تھوڑا سنکی بھی' اس لیے بلیک میلنگ سے شاید بات نہ بنے۔ سو میں نے شیطان کا کبھی ناکام نہ ہونے والا ہتھیار استعمال کیا۔ اس لڑکی کو نوکری کی تلاش تھی۔ اس کا تازہ تازہ بریک اپ ہوا تھا' تو مجھے اسے CHIL کرنے کے لیے سمیع عرفات کا پتا دینا پڑا تھا اور میرا پلان بھی کامیاب رہا۔ بہت جلدی سب کچھ ہمارے حق میں چلا گیا۔"

صبا آپا مسکرانے لگیں اور زندگی اسی مسکراہٹ کو محبت کے قالب میں ڈھالتی آگے بڑھ گئی تھی۔ آگے کا راستہ بالکل صاف' شفاف' اور خوش گمانیوں سے بھرا تھا۔ خوش گمانیاں جو کبھی کبھی سچ بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔

ختم شد

ہوتا نہیں ہے۔ بھٹکنے والے ستارہ بن جاتے ہیں اور منزل پر پہنچ جانے والے خاک ۔۔۔ فرق روشنی اور سیاہی کا ہے جو بھٹکتے ہیں وہ اوروں کے لیے آگے جانے کا راستہ بناتے ہیں۔ سنگِ میل ہوتے ہیں اور جو منزل پر پہنچ جاتے ہیں' بنا کسی محنت کے ان کے حصے میں قناعت آتی ہے۔ قناعت جو دلوں کی موت ہے' آرزو کی موت۔ پوری موت انسان کو ہر اذیت سے چھٹکارا دے دیتی ہے مگر آرزو کی موت ہر پل مچھلی کی طرح جال میں پیوست رہتی ہے۔ جاننے اور نہ جاننے میں ٹھہرا ہوا ادھورا دلیز کو رنگ لگا جاتا ہے اور اس نے اپنے اندر اس ادھورے کی رنگ کو پھیلتے محسوس کیا تھا۔

مسئلہ ہے بس یہی
مل گئی جب آگہی
پھر خوشی جاتی رہی

محبت رنگ ہے' خوشبو ہے' اس کی انگلیوں کی پوروں نے بھی رنگ چھیڑے تھے۔ اس کی آنکھوں نے بھی خوشبو پی تھی۔ جی بھر کر لفظوں سے خواب تراشے تھے اور سوچا تھا دنیا میں اگر کہیں کچھ اپنا ہے تو صرف یہی حوالہ ہے۔ مگر یہ حوالہ کتنا ادھورا نکلا تھا۔ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

"جھوٹ تھی اس کی محبت۔ سچ تھا میرا دل۔ پھر کیا ہوا جو وقت کی تمازت سے جھوٹ کا رنگ گہرا ہوا اور دل سا سچ گہنا گیا۔"

"سنو لیلیٰ! اس سے ملو یہ ہے میری نئی کولیگ! ہم بہت اچھے دوست ہیں۔" اس نے چونک کر اندر سے باہر آ کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے اس نئے جملے کو سنا اور ہنس کر سوچا۔

"بیوی کچھ بھی نہیں ہے جس کی روح میں پلنے کے خواب دیکھے ... کو سہل اور بڑے ہی محبت نے اسے دھتکار دیا تھا۔"

ہمارا عشق لاحاصل بلندی تک بھی پہنچا تھا
کبوتر کے پروں کے ساتھ ہم نے دل کو باندھا تھا

وہ پتھر تھا میں شیشہ تھا' تعجب کیوں نہیں تم کو
اسے ٹھوکر لگانا تھی' مجھے بھی ٹوٹ جانا تھا

اسے ٹھوکر لگانا تھی مجھے بھی ٹوٹ جانا تھا۔" مگر ان ٹھوکروں سے کراہیں تو نکلی تھیں وہ جو ٹوٹ کر بکھرا نہیں تھا اور سکا اس کے وجود کی حقیقت تھی۔

کچھ باتیں لفظوں میں دکھ کی طرح محسوس تو ہوتی ہیں مگر حقیقت میں ادراک ہوتا ہے تو لگتا ہے یہ سب باتیں اضافی ہیں۔ کوئی کسی کے بغیر نہ مرتا ہے نہ ہی کسی کے دھکے دے کر نکال دیے جانے پر سائل دستِ سوال پھیلانا چھوڑ دیتا ہے۔

مانگنے والے کو تو عادت ہوتی ہے۔ تیرا دستِ سوال نہیں تو کسی اور کا دستِ سوال سہی' کچھ لوگوں کو خیرات لینے کی عادت ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کو خیرات دینے کی اور دنیا ان ہی دو افراد کے گرد ہی گھوم رہی ہے۔ مگر وہ جان نہیں پائی تھی کہ وہ کس قبیلے کی فرد تھی اور محبت تھی کہ اس کے خالی دامن پر منہ بھر کر قہقہہ لگائے جاتی تھی۔

"جان! ہم جو لپ سٹک کی ہمارا چہرہ ہیں مسز زمر نعیم ہیں ان کی پروڈکٹ آج کل مارکیٹ میں کافی اِن ہے۔ آج کل ان کے ساتھ ہماری ایک ڈیل چل رہی ہے۔ ہمیں ایک نیا چہرہ چاہیے جو خوبصورت بھی ہو اور معصوم و اچھوتا بھی۔" وہ ہاتھ تھام کر مسز زمر نعیم کے سامنے لے گیا تھا اور ایک تعلق کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہی تھی۔

"سب جانتے ہیں۔ تم میری کتنی اچھی دوست ہو۔ میں کیا اپنی زندگی کی ہر بات کسی سے شیئر نہیں کرتا۔ صرف تم سے شیئر کرتا ہوں تم میری دوست بھی ہو' سب کچھ ہو مگر کچھ حوالے میرے لیے ہیں دنیا کے لیے۔" اور جو دنیا کے لیے حوالے تھے۔ ان حوالوں میں اس کا کوئی بھی پسندیدہ حوالہ نہیں تھا۔ خاموشی سے مسز زمر نعیم کی چکنی چپڑی باتیں سن رہی تھی۔

وہ جان جان کر اسے جس طرح چھو لینے کے قابل

تھے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے کے شیدائی تھے۔ اس نے اس کا دل کھلتا ہوا پایا کچھ بھی تھے اس قدر نیچے اترنے نہیں دیتے تھے۔ کانٹریکٹ کو صرف خوبصورت تیج' چاہنے ہو ٹھنک اور سیر تفریح اور مستقل مل' مگر حارث کاظمی کام کے لیے کوئی حدود نہیں رکھتا تھا۔

"تمہیں یہ کانٹریکٹ ہماری ایڈورٹائزنگ کمپنی کو دلانا ہے۔" وہ حکم دیتا اور پھر وہی ہوتا جو اس بزنس کو حاصل کرنے کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ حارث کاظمی کی آنکھوں میں چمک ہوتی اور کاندھے پر ... نہیں۔

"ٹھیک ہے... اچھی تم سے بہترین ساتھی مل ہی نہیں سکتی تھی تم سمجھتی ہو مجھے کب کس وقت کس روپ میں تمہیں دیکھنے کی تمنا ہے اور کیا تمنا ہے صرف تم جان لیتی ہو۔ لیلیٰ! تم ہی صرف مجھے سمجھ سکتی ہو۔ آج تک میں نے خود کو بھی پورا کا پورا کسی کو نہیں سونپا۔" اور وہ بانٹی رہ جاتی۔ سچ کی کرنوں کے ساتھ ادھورا پن اس نے قلب میں روتے بچے کی طرح بلکتے دیکھا۔

گیا جواب کا ہوتا تھا جس طرح آیا کرتا تھا۔

"تمہیں میں آپ کو سائن کرانا چاہتا ہوں۔"

"مس لیلیٰ..." وہ کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی' اب دونوں کی باتوں سے ایک فیصلہ' ایک حتمی فیصلہ اخذ تھا اور اس نے کنسائن کر لیا تھا۔

"مسز زمر نعیم! میں نے آج سے پہلے کبھی ماڈلنگ نہیں کی یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔ مجھے اس کام کی نہ تو سمجھ ہے نہ اس کام میں انرجی ضائع کرنے کا شوق ہے۔"

"ارے لیلیٰ... تم اس کی فکر مت کرو۔ افراہیم تمہارا ... ایک کمال تو یہ ہے ... چہرے کی اتنی ... تم تو پھر بھی ایک گرام آرٹسٹ ہو تم خوبصورتی آرٹسٹ ہو۔ تم میں اتنا اعتماد ہے کہ تم افراہیم ... کو بھی پیچھے چھوڑ دو گی۔ مت انکار کرو۔ یہ تمہاری ایک نئی سمت ہے دیکھو اور سوچو تمہیں لیلیٰ جمیل بننا چاہیے صرف لیلیٰ۔" جس نے سر جھکایا وہ لیلیٰ جمیل کے حوالے کو چھوڑ کر گھر سے نکلی تھی یا باپ نے کیا تھا۔

"بتا سکتا ہوں۔ کون گھر سے باہر نکل جانے والی لڑکی کا حوالہ بنتا ہے۔ کون تمہارا ہاتھ تھامتا ہے' کون تمہیں لیلیٰ جمیل سے پہچان کر نام دے سکتا ہے۔ سن لو تم صرف لیلیٰ جمیل کے نام کے ساتھ محفوظ ہو ورنہ بے نام' بے گھر لڑکیوں کا آخری مقام کہاں ہوتا ہے یا خودکشی۔"

اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور نکل آئی تھی۔

وہ لیلیٰ جمیل' سے صرف لیلیٰ بننے کا ارمان لے کر چلنے والی تھی بے وقوف لڑکی تھی جو گھر کی پناہ کو چھوڑ کر نکل آئی تھی اور لیلیٰ جمیل بن سکی تھی نہ لیلیٰ رہی تھی۔ ایک چوری چھپے کا حوالہ لیلیٰ حارث ہی تو مگر وہ بھی صرف خاموشی' تنہائی اور خفیہ رابطہ کا رستہ تھا۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا اور اب یہ ہی ... بن گئی تھی۔

اس نے کتنی مشکل سے خود کو اس کام کے لیے مجبور کیا تھا اور خاموشی سے اس کام کو نبھانے میں لگ گئی تھی اور پاپا کی ... بھری آنکھیں اسے جہاں جس محفل میں دیکھتیں ... پوچھتا نہیں ہو تم ... پھر کون سا نام تمہارا کس گھر میں رہتی ہو اب کیا وہاں لیلیٰ کو پہچاننے والا حلقہ پیدا ہوا بھی یا ابھی تک جھوٹے شخص کو رو رہی ہو۔ تعریفیں چرا لیتی اور لوگ کہتے۔

"ایلیٹ سوسائٹی کی ایک خود سر لڑکی نے باپ سے تنگ آ کر اس کے اصولوں سے جان چھڑا کر ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ اس کے اپنے دوست 'اپنی' الگ دنیا ہے اور یہ ماحول کوئی اتنا چھوٹا اور نیا بھی نہیں تھا کہ سب چونک اٹھتے۔ سب نے اس کو نارمل کارروائی سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس زندگی کو ... خود قبول نہیں کر سکی تھی۔

اب بھی پاپا کے گھر جایا کرتی تھی اور ان دنوں تو اس کے چکر اور بڑھ گئے تھے۔

"یہ جو پروڈکٹ ہے' انٹرنیشنل لانچ ہو گی اور ملا اس کے کاروباری ... ساری شوٹنگ ہمیں باہر جا کر کروانی پڑ رہی ہے' لیکن اس پروڈکٹ کی جو فلمیں ڈیولپ ہو رہی ہیں' جیسے اس کی پبلسٹی ہو رہی ہے وہ بہت خوفناک ہے۔ مجھے نہیں اچھا لگ رہا ہے۔ آرٹ کلا

خوبصورت جھانسے ہیں مما! یہ صرف ہماری تذلیل ہے۔ صرف ہمارے اندر سے ہمیں باہر لا کر حقارت سے ٹھوکر مارنے کی سازش ہے کہ تم یہ ہو' صرف اتنی عام سی لڑکی! اس برتے پر تم اکڑتی پھرتی تھیں۔ کون سے تشخص کے لیے بولائی پھرتی تھیں۔ مما! مجھے صرف گھر چاہیے۔ نام نہیں صرف گھر چاہیے۔" وہ ہسٹیریک ہو کر واپس لوٹ آئی تھی اور بہت سی اداس شاموں کے بعد آج گھر سے باہر نکلی تھی تو ذات سہیلی ساتھ تھی اس لیے وہ مطمئن تھی۔ ہر لمحے کو وہ اسی طرح جی رہی تھی' جیسا اس کے جینے کا حق تھا پھر ایک سڑک پر اس کی گاڑی رک سی گئی۔

"یہ بچہ بھوکا ہے یا صرف دھوکا ہے اور بھیک مانگنے کی اس کو عادت ہے۔"

اس نے ذات سہیلی کی طرف دیکھا اس نے پرس سے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے مگر وہ بچہ ۔۔۔ وہ غرور انا کے بار سے جھکا جا رہا تھا۔

"میں حق لوں گا۔ خیرات نہیں۔۔۔" وہ کار سے باہر آگئی تھی۔

"تم پڑھے لکھے ہو شاید۔" اس نے اپنی ذہانت سے کام لیا اور وہ بولا۔

"جی باجی جی! پانچ کلاس پڑھا ہوں سب کام کر لیتا ہوں اگر کام دو تو بھی مایوس نہیں کروں گا۔" اس نے سوچا اور اس دس برس کے بچے کو گھر لے آئی۔ اس کے لیے کپڑے کھانا وغیرہ سب مفت تھا اور وہ اس کے گھر کے کام کاج میں جتا رہتا تھا۔ حارث کاظمی ایک ویک اینڈ پر آیا تو بلاوجہ جھنجلانے لگا۔

"یہ کیا نئی چیز نکالی ہے' میں نے تم سے کہا بھی تھا' مجھے نوکر پسند نہیں' یہ ادھر کی ادھر ایک کی دس لگاتے ہیں۔"

وہ اس کے دفاع میں سامنے آکھڑی ہوئی۔

"تو کیا ہوا [illegible] نہیں ہے۔ یہ یہیں رہتا ہے' کہیں نہیں آتا جاتا' تمہیں پتا ہے حارث! یہ پڑھنے میں بھی تیز ہے' میں فرصت میں اسے پڑھا بھی رہی ہوں۔"

"بہت خوب اچھی جا رہی ہو۔ مجھے لگتا ہے یہ

سوشل ورک کی کوئی شکل ہے۔ سنو تم فارغ وقت میں کلب جوائن کر لو۔ کہیں کسی پارٹی میں ایڈجسٹ کر لو۔ اچھا وقت گزرے گا تمہارا بھی اور میرا بھی۔"

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی جانتی جو کہ لفظوں سے کھیلنے والے کا وقت پر آکٹ کیسے [illegible] اس کے پاس وعدے بھی ڈھیر سارے تھے اور انہیں نبھانے کی سرشاری بھی' بھول جانے کے حیلے [illegible] جزا ردوں' اور وضاحت کرنے کا حوصلہ بھی۔ بے وقت میں تو وہ آن پھنسی تھی۔ مما کئی بار اس خفیہ ریلیشن شپ کو توڑنے کا عندیہ دے کر عباس رضا کی بابت اس سے پوچھ چکی تھیں۔

عباس رضا اس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ اس کے بچپن کا دوست جو لیلیٰ کی دولت' غرور اور ماما کی تنگی کی بے رنگی سے چڑ کر اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اور آج کل وہ پھر سے اس کی زندگی کو سنوارنے کی قسمیں کھانے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کا راستہ بھی روک لیتا تھا۔

"تم جو بھی ہو۔ کوئی بھی شہرت یا ندامت ہو تمہارے ساتھ' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پہلے تمہارے [illegible] دولت' ان کا غرور راستہ روکتا تھا' لیکن اب میں خود مختار ہوں اور تمہاری زندگی کو سنوار سکتا ہوں کیونکہ میں پھوپھو کے سوا کوئی نہیں۔ کیا تم اپنے پچھلے حوالے سے منہ موڑ کر ہمارے گھر نہیں آسکتیں؟" قدموں کو جانے کی ہوک سے چھپتا دیکھتی مگر پھر تھم جاتی۔

اس کی محبت جھوٹ سہی لیکن خود اس کی محبت سچ تھی نا! وہ کیسے منہ موڑ کر بے وفائی کا طوق گلے میں ڈال کر آگے بڑھ جاتی۔

لیلیٰ کے پاس تو وہ تھی۔ حارث کاظمی کے پاس جھوٹے قصے سنانے کے لیے کوئی نہ ہوگا تو وہ شاید پاگل ہی نہیں ہو جائے گا۔ وہ ان میں سے تھی جو اپنے قاتل کا بھی بھرم رکھتے ہیں۔ رسوا نہیں کرتی کسی کو بھی نہ دل توڑ دل کو بے بھرم کرنے والوں کو۔ لیکن آج کل جس طرح الوینہ حارث کاظمی کے ساتھ اس کے فلیٹ میں آنے لگی تھی' جیسے جام دور چلے تھے جو کھوکھلی گفتگو ہوتی تھی۔ [illegible]

سعدیہ عزیز آفریدی
یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت تھی کہ اس کے پاپا ہزاروں میں نہیں تو لاکھوں میں ضرور ایک تھے۔ وجیہہ لمبے اور تیکھے افغانی و ترک حسن کا منہ بولتا شاہکار جو دیکھ لیتا، کشش سے کھنچتا چلا جاتا پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان کی بیٹی ہو کر دن رات ان کے قریب رہتے ہوئے ان کے سحر سے بچی رہتی۔ اس کی تو صبح اور شام اپنے پہلے سے پاپا کے نام سے اور چہرے سے ہی شروع ہوا کرتی۔

کر وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر آج کے واقعے نے اُن
کا اعتماد متزلزل کر ڈالا تھا۔
آج دیکھ بھال سمجھی کے باوجود اندر سے وہ ایک
عام سی لڑکی نکلی تھی اپنی صنف کی طرح عام سی۔
"میں کیا کروں میرے رب! مجھ سے اپنی بیٹی کا کوئی
دکھ نہیں دیکھا جائے گا۔ وہ لڑکی جن کر نہیں جانتی کتنے
پرُخار راستے پہ قدم رکھ رہی ہے۔ یہ دنیا اُسے جینے
نہیں دے گی۔ ہر موڑ ہر قدم پر اُس سے اُس کی ماں کی
بابت پوچھا جائے گا۔ پھر وہ کیا کرے گی۔ اس لفظ پر
اگر لوگ اُسے رد کر دیں گے پھر میں کیسے پونچھوں گا
اُس کے آنسو۔ کیسے بلاؤں گا اُسے زندگی کی طرف۔
اس کا بھرم ٹوٹا تو وہ کرچی کرچی ہو کر بکھر جائے
گی۔ کون دے گا اس کا ساتھ۔ کون ہاتھ تھامنے والا تھا۔
بھی لے گا تو تمام عمر اُسے ایک ناکردہ جرم کی سزا میں
سولی پر نہیں لٹکائے رکھے گا اور میرے رب میں
کیا کروں اپنی چاند سی بیٹی کے لیے جو گڑیوں کی طرح شفاف
دل رکھتی ہے جو سمندروں کی طرح وسعت رکھتی ہے۔
میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" انہوں نے دونوں
ہاتھوں میں سر تھام لیا لفظوں نے پوچھا۔
"اصلکان احمد یہ سب درست سہی مگر کیا تم
اُسے بیٹا بنا کر یہ سمجھنے لگے تھے وہ واقعی بیٹا بن گئی ہے۔
تم نے اس کی خواہشات تمناؤں کا کبھی خیال نہیں کیا۔
اصلکان احمد تم اس کی معصوم خواہشوں کے قاتل ہو۔
رجا صہیب کی سزا تم نے تسلی کی سیلوفین پیکنگ میں
رکھ کر سود سمیت اپنی بیٹی کی جھولی میں ڈال دی۔ رجا
کا جرم گناہ واقعی قدم قدم پر اُس کے لیے رکاوٹ تھا۔
مگر تم نے کبھی اُسے مضبوط نہیں کیا۔ کبھی اُسے اپنے
وجود سے نکھار نہیں دیا۔ تم نے اور دل سے
رد عمل کا انکار بھی نہ کیا۔ بس اپنے لیے ایک حصار
بنا لیا اور اس سے ایک انچ نہ ہلے۔ کیا پتا تمہاری
بیٹی کی فرشتوں ایسی صورت خود اس کی دلیل بن جاتی۔
[illegible] ہلا دو۔"
پھر سے بے کلی نے گھیر لیا۔ سو وہ لان میں نکل
گئے۔ سرخ لیمپ کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے۔ صبح
آنکھ انجل کی بے ساختہ چیخ پر کھلی۔
"ہائے پاپا! اتنی سردی میں آپ باہر سوئے
رہے ہیں؟"
بے ساختہ شال پاپا کے گرد لپیٹ دی۔ اُنہیں
بے سبب پیار آ گیا۔ سرا اٹھو کے بول کانوں میں پڑے
"بیٹی بڑی رحمت ہے اصلکان احمد بیٹی تو
بھی ہے۔ آپ کو زندگی سے پیار کرنا سکھا دیتی ہے"
وہ محبت سے سوچتے ہوئے اُسے تکنے لگے تھے
وہ احساس کیسے بنے جن کی دل کی دنیا کی تہہ میں بیٹی
بیٹا بن کر انہیں سہارا دیتی۔ بیڈروم میں جانے تک ساری
رات سردی میں بیٹھے رہنے سے ہاتھ پاؤں سن سے ہو
رہے تھے۔ کچھ سینے میں تکلیف کی بھی ہو رہی تھی
رہی تھی۔ سو اُنہوں نے بات بڑھنے سے پہلے ڈاکٹر
کو کال کرنے کا حکم دے ڈالا۔ چیک اپ ہوا تو
کھلا۔
"ہلکا سا نمونیا کا اٹیک ہوا ہے۔"
انجل نے سنا تو سارے ملازموں کی شامت
آ گئی۔ آتشدان میں لکڑیاں ڈال کر کمرہ گرم کرنے لگی۔
سات بجے بھی کڑاکے کی سردی تھی ان پر دو کمبل ڈالے
ہوئے تھے مگر اسے سکون نہ ملا تو اپنا کمبل بھی لا
لائی۔ پاپا کے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر گرم کرنے لگی۔
اس کی پریشانی دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اور خود پاپا بھی
بے بسی سے سرنیچے پڑے لیٹے اتنے قیمتی خزانے کے مالک
بنے تھے نہیں سہارے تھے۔ آج زندگی میں پہلی بار
انہوں نے سوچا تھا۔
"کرا اگر رجا آ اپنے ساتھ ان کی یہ قیمتی متاع بھی
لے جاتی تو وہ کیسے دن کرتے کیسے رات کاٹتے۔"
"انجل! آئی لو یو بیٹا!" انہوں نے چہرے سے
رخسار چھو کر جذب میں کہا تو تیز تیز باتیں کرتی انجل
کو سکتہ ہو گیا۔
"آج اتنا غیر معمولی جملہ اتنے غیر معمولی ہونٹوں
سے ادا ہوا تھا کہ روم روم حیران تھا۔ پاپا ذرا بھی
کر تیز جھوٹ کہتے تھے پھر یہ آج پاپا کیسے
لہجے میں کہہ رہے تھے کہ انہیں لگتا ہے تیز کرنا
ہے۔"
"پاپا آپ! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔"
"نہیں نہیں بالکل ٹھیک ہوں۔ البتہ میرا اعتراف
بیماری سے بھی کم زور ہے کہ تمہیں جس سے ہو گئی ہے۔"

سعدیہ عزیز آفریدی

میرا خیال تھا سارے ماں باپ اپنے بچوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی میں، لیکن میرے ہم سفر عامر مرتضیٰ کا خیال تھا میں بچوں کی محبت میں اپنا آپ تک بھلائی جا رہی ہوں۔ مجھے تو کبھی کبھی یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ خود میرا نام نوید عامر ہے جو اس چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں رہتی ہوں۔ اب آپ سے کیا پردہ، دراصل ایسا کبھی کبھی بھول چوک میں ہوتا ہے اور بہت زیادہ میری عدیم الفرصتی کا شاخسانہ قرار پاتا ہے۔ میرے تین بچے ہیں۔ عمیر، عمر اور علی اور تیسرے خود عامر۔ مجھے تو کبھی کبھی وہ بھی اپنے بارہ سال کے عمیر کے جیسے ہی لگتے ہیں۔ لاابالی، قدم قدم پر میری توجہ کے مستحق۔ سو جب مجھے معلوم ہے ایک بجے تک یہ چاروں طوفان میل لنچ کے لیے آنے والے ہیں تو خود بخود زبان ریسیور اٹھاتے ہی بھول جاتی ہے کہ میں نوید ہوں۔ اب پوری تفصیل میں جائے "اپنی بچوں کی خیریت بتانے میں کچھ تو وقت صرف ہوگا نا! اس لیے چھوٹتے ہی کہہ دیتی ہوں۔

"سوری۔ یہاں نوید نہیں رہتیں۔" دوست پریشان "نوید کا گھر سلامت رہے۔" اور میں ان دعاؤں کی اتنی لالچی کہ چوری پکڑے جانے پر بھی شرمندہ نہیں ہوتی۔ سہیلیاں تو تھیں جو مجھ سے میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں، اس لیے ایک آدھ بار مجھے کال کا جواب [illegible] کبھی [illegible]

"تم ہے نوید جب تو کہتی تھی، یہاں نوید نہیں رہتی تو ہماری تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی تھی کہ اس گھر میں خدانخواستہ نوید نہیں ہے تو یہ کھلی اور سریلی آواز کس کی تھی" کھٹاک سے عامر کا فون ملا کر حجت کرتے تب عامر بھائی فون کرتے۔

"تمہاری نوید کے علاوہ کہیں دیکھ لیا تو۔ تمہاری دوست کے ہاتھوں جان سے نہ چلا جاؤں گا۔"

"عامر! آپ دیکھیے ساڑھے بارہ ہو رہے ہیں، کچن میں مصروف ہوں اس لیے یادداشت کو بھاپ لگ گئی ہے۔"

میں جب یہ سب سنتی تو خوب ہنستی اتنا کہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ پھر یوں ہوا ہم سب کو اس روٹین کی عادت ہو گئی۔ بچے بڑے ہونے لگے تو عامر کو ایک نئی سنک چڑھی۔

"نوید! تم بچوں کے چکر میں خود کو بھولنے لگی ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں آج بھی صبح ہی صبح اٹھتی تھی، شاور لے کر صبح کی نماز، ناشتہ، بچوں کی تیاری، ان کا ہوم ورک، پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری۔ سارے کام میں اسی ترتیب سے کر رہی تھی لیکن عامر کو کچھ کمی لگ رہی تھی۔

میں سوچ سوچ کے پاگل ہوئی جا رہی تھی جب صبح کے برتن جھاڑو کرنے والی رحمتے نے کہا۔

"مرد کا سایہ چاہتا ہے، دن رات اس کی غلامی کروں پر جی گھر، بچے سب دیکھنا پڑتا ہے۔ بچوں کی روٹی فکر نہ کروں تو ان کی سانس کیسے چلے بی بی جی۔ مرد کا سایہ نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کچھ نہ کرو، بس میری چاکری کرتی رہو۔ بی بی جی ایسا بھی ہوتا ہے۔"

ماسی رہتے پندرہ سال سے مختلف گھروں میں کام کرتے کرتے اچھی خاصی اردو بولنا سیکھ گئی تھی لیکن لہجہ آج بھی اس کا پنجابی تھا' مجھے اس کے لہجے سے کیا مجھے تو اس کی بات سے مطلب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں بچوں کو رات کا دودھ کا گلاس تک دے کر ہر کام سے نمٹ کر عامر کے پاس آکر بیٹھی تو انہیں مصروف پایا۔ وہ کچھ فائلوں میں سر گھسیڑے جانے کیا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کوئی میرا جہاں ڈھونڈ رہے ہیں کیا؟" اچانک سوال پر وہ چونکے' ریم لیس عینک کے اوپر سے جھنجلائی آنکھیں صاف مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔

"کیا یہ میرا جہاں میرے چہرے کے نقشے سے ملاقات ہوا کرتا ہے؟"

انہوں نے کچھ نہیں کہا' بس مجھے گھورتے رہے۔ اور میں جانتی تھی۔ ان کا خراب موڈ کیسے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔

میں نے ہولے سے ان کے ہاتھ سے فائلیں چھینیں' انہوں نے مزاحمت نہیں کی' میں فائلز سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر لوٹی۔

وہ مجھ پر ہی مرکوز تھے۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے پھر مسکرا کر بولی۔

"آج کے بعد میری توبہ جو میں اپنے آپ کو بھولوں۔"

ہاتھوں کی نرماہٹ ان کے غصے پر شبنم کی طرح گرنے لگی۔ غصیلی آنکھوں میں شوخی کا پی اور بس ہونٹوں تک آئی مسکراہٹ وہ روک سکتی تھی۔

میں نے انہیں آسودگی سے دیکھا اور انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکا میرے جملے میں چھپی اقرار بھری عنایت کو انہوں نے ایک لمحے میں کیچ کرلیا تھا پھر دوسری صبح بہت پُررونق تھی۔ عامر مرتضیٰ گنگناتے ہوئے تیار ہو رہے تھے اور میں بچوں کے ساتھ انہیں بھی پوری اٹینشن دے رہی تھی۔ ان کی ٹائی جو پہلے

مجھے بیڈ پر صوفوں کے ساتھ رکھ کر عامر لذیذ سا ہو جاتی تھی کہ آج ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور ان کی آنکھوں کی چمک۔

"آج تم پر بہت پیار آ رہا ہے، چلو ڈنر نہیں بناتے۔ کہیں گھومنے چلتے ہیں۔"

انہوں نے پروگرام بنایا مگر میرے محبت بھرے شام کے اقرار پر وہ پوری شدت سے ڈنر کے لیے تیار ہونے لگے۔ بچوں اور عامر میں کب وقت بیت گیا۔ پتا ہی نہ چلا۔ پہلے میں عامر کا خیال رکھتی تھی لیکن آج کل عامر میرا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ دن بدن میری کمزور ہوتے اعصاب شکن جدوجہد انہیں ہراساں کیے رکھتی۔

"بس تم خوش رہا کرو۔ کچھ بھی مت سوچا کرو۔"

وہ اکثر مجھ سے یہی کہتے مگر سوچنا تو ایسا فعل ہے جو چھتے کی موقوف نہیں ہو سکتا تھا مگر پھر بھی میں کوشش کرتی کہ میں عامر کو آزردہ نہ کروں یہی وجہ تھی کہ میں ان سے عمیر اور عمر کی نامحسوس لاتعلقی پر بحث نہیں کرتی۔ پھر وقت بیتے جا رہا تھا کہ اچانک عامر بچوں کے البم لے کر بیٹھ گئے۔

"ہم نہیں جانتے مستقبل میں ہمارے لیے کیا ہے۔ حال میں تنہائی ہے، لیکن ماضی میں کتنی اچھی یادیں ہیں۔ چلو آج انہیں یاد کریں، ان دنوں کو جو ہماری مٹھیوں سے سب سے قیمتی سال لے گئے مگر جھولی میں بہت سارے خزانے الٹ گئے، اتنے زیادہ کہ پھر زیاں کا احساس اتنا زیادہ نہیں رہتا۔"

ہم دونوں مگن بیٹھے تھے۔ عمیر کی دو سال کی عمر کی تصویریں کھلی پڑی تھیں۔ آنکھوں میں نم چمکنے لگا، پتا نہیں محبت کی ان کہی کیوں آنکھوں میں چھلکتی ہے، صرف مسکراہٹ کیوں نہیں دیتی۔

عامر تصویر دیکھ کر ہنس رہے تھے اور میں انہیں ہنستا دیکھ کر [illegible] انگلیوں کی خوشی جگنو کی طرح ہوتی ہے جو مرتے دم احساس دلاتی ہے 'آپ کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔ آپ کے جیون ساتھی کی آنکھوں میں آپ کے بچھڑنے کا دکھ آپ کے ملنے کی خوشی کا ہی دوسرا روپ ہوتا ہے جو کہ ہے۔

"تم نے جس طرح مجھ پر زندگی سہل رکھی۔ اس عنایت پر میرا دل کبھی تمہیں نہیں بھلا سکتا۔"

اور یاد رکھے جانا کوئی ایسا بھی کم قیمت کام نہیں کہ جسم و جان میں سرور بن کر دوڑنے کی جسارت نہ کر سکے۔ اور میرا دل یہی جسارت بار بار کر رہا تھا میں نے تھک کر عامر کے زانو پر سر رکھ دیا تھا اور وہ تصویریں رکھ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہو گیا۔ تھک گئی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟"

انہوں نے نبض چیک کی اور میں مسکرانے لگی۔

"بالکل ٹھیک ہوں، بے فکر رہیے۔ اتنی جلدی جان نہیں چھوڑنے لگی۔"

وہ پھیکی ہنسی سے میرے چہرے کی زردیوں میں وہ کھوجنے لگے جو کہیں قریب تھا، شاید کچھ مہینوں یا شاید کچھ سالوں کی دوری پر۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنی مٹھی میں بھینچ لیا تھا پھر بے قراری سے بولے۔

"کچھ نہیں ہو گا تمہیں، جب تک میں زندہ ہوں ناں تو تمہیں بھی زندہ رہنا پڑے گا، ورنہ سخت جھگڑا ہو جائے گا۔"

میں ہنسنے لگی تھی۔ یا شاید رونے لگی تھی۔ ان سے بچھڑنا اذیت ناک میرے لیے بھی تھا۔ مگر یہ کم بخت ناہنجار دل تھا۔ سنتے ہی میں کہاں تھا۔ میرا پچھلے سال بائی پاس ہو چکا تھا، لیکن طبیعت کی کسلمندی دور ہی نہیں ہوتی تھی۔ ہر صبح بہت ساری گولیاں کھا کر شروع ہوتی اور رات آنکھوں میں کٹتی۔ پھر کس امید پر طویل ساتھ کی قسم کھائی مگر عامر مرتضیٰ وہ بھی محبت میں میری طرح خبطی تھے۔ اتنے یقین سے جھوٹ بولتے کہ واقعی سچ لگنے لگتا اور مجھے لگتا میں بہت طویل جیوں گی۔ لیکن آج نجانے کیوں ہر روز سے زیادہ دل بھر کر چلا آیا تھا، تبھی انہوں نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دی تھیں۔

عامر آ گئے تو وہ ان کی گود میں جا کر سب سے پہلے یہی بولا تھا۔

"پاپا! آج ہماری گرل پر ایک بڑا آ کر بیٹھا تھا۔"

عامر نے چمکار کے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "کون سا بڑا تھا عمیر!۔"

عمیر نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نے بولنا چاہا مگر عامر نے ہاتھ پر دباؤ ڈال کر مجھے روک دیا۔ وہ اس کی یادداشت کا امتحان لے رہے تھے لیکن وہ ہار گیا پھر منہ بسور کر بولا۔

"ممّا! وہ کالا کالا پرندہ کون سا تھا؟"

"کوا۔۔۔ بیٹا! کرا۔۔۔" میں نے عامر کی گود سے اسے لے کر بانہوں میں بھینچ کر جواب دہرایا اور عامر شوخی سے مجھے دیکھنے لگے۔

پھر گنگنائے۔ "کاش۔۔۔"

میں ان کے جملے کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ میرے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر شاور لینے چلے گئے پھر ہم شام کو باہر گھومنے گئے تھے، بے شمار تصویریں کھینچیں۔

میں واپس لوٹ آئی تھی۔ عامر ہر تصویر سے جڑی یاد دہرا رہے تھے۔ شاید وہ تو شروع سے ایسا کر رہے تھے لیکن میرے خیالوں کے جزیرے میری سانس سے زنجیر ہو گئے تھے۔ میں کبھی خیالوں میں ہوتی، کبھی حال میں، کبھی مستقبل میں ایک یاد بن جانے سے کرلاتی ہوئی کونج کی طرح بے حال رہتی۔ میرے چہرے پر پسینہ آ گیا تھا۔ شاید ماضی سے حال میں آنے میں اتنی ہی تیزی سے سانس پھولتا جاتا ہے۔ عامر سب کچھ بھول کر میری دواؤں کے باکس کی طرف بھاگے تھے پھر دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں وہ منرل واٹر کی بوتل اور گولی سمیت میرے سامنے کھڑے تھے۔

"تم [illegible] شاید [illegible] گئی تھیں اس لیے ہارٹ بیٹ غیر متوازن ہوئی تھی۔"

گردن کے نیچے ہاتھ رکھ کر انہوں نے مجھے دھیرے سے اٹھا کر دوا کھلائی اور وہ تین تکیے اونچے کر کے مجھے آرام دہ حالت میں لٹا کر قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کلائی ان کے مضبوط ہاتھوں میں تھی اور دل پکارنا چاہتا تھا، یہ ہاتھ میرے ہاتھوں سے نہ چھوٹیں مگر تقدیر کا فیصلہ۔۔۔

میں نے ایک لمبی سانس کھینچی اور عامر کی آنکھوں میں ہراس آ گیا۔

"کیا ہو گیا ہے؟ تکلیف زیادہ ہو رہی ہے کیا؟ ڈاکٹر کے پاس چلو۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں ٹھیک ہوں، گھبراؤ نہیں۔ بس ویسے ہی حسرت ہو رہی تھی۔"

"حسرت۔۔۔ کس چیز کی حسرت۔۔۔" انہوں نے مجھے دلداری سے دیکھا اور لب کانپے۔

"کتنے پیارے ہیں آپ، اتنی محبت ملی ہے مجھے آپ سے مگر وقت وافر نہیں ہے۔"

"بکو مت، فضول سوچوں کو چھوڑ دو۔ بس یہ سوچو ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔"

"کاش۔۔۔" میں نے ماضی کی طرح شوخی سے کہنا چاہا لیکن عامر کا لہجہ مجھ تک آتے آتے سوائے حسرت کے کچھ نہیں تھا پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی جب [illegible] کرتے کرتے کال بیل پر عامر کی جگہ عمیر اٹھ کر گیا۔ واپس آیا تو اس کے کریڈٹ کارڈ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں کھانا کھا رہی تھی، اس لیے بے دھیانی میں بولی۔

"کون تھا عمیر۔۔۔؟"

"ڈاکیا ماما!۔۔۔" اس نے بہت دھیرے سے کہا۔ میں پھر سے عامر کی پلیٹ میں سالن ڈال رہی تھی، جب اچانک دماغی رو کال بیل کی طرف چلی گئی۔

"دروازے پر ابھی کون آیا تھا عمیر؟"

"ڈاکیا تھا ماما! ڈاکیا۔۔۔" عامر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے عمیر کو گھورا مگر وہ اپنے میں مگن رہا۔ عمیر۔۔۔ عامر۔۔۔ دونوں بس ایک دوسرے کے لیے تھے۔ دونوں کی پسند، ناپسند، ایکٹیویٹیز سب یکساں تھیں اور دونوں کی لسٹ ہی میں ہم دونوں نہیں آتے

[illegible] لگتا تھا ہم نے صرف وقت گنوایا ہے اور
[illegible] وقت میں بہت سارا روپیہ کما کر زندگی
[illegible] بچے اور روپیہ کمانے کے لیے
[illegible] رشتہ پر کو ذیمیر نہ بن سکے۔ یہی وجہ
[illegible] لسٹ میں ہم نہیں آتے تھے۔
[illegible] محبت میں ہماری ہی طرح بخیلی تھا۔ ہر
[illegible] کے فون آتے اور فون سے آدھی ادھوری
[illegible] ایک گھونٹ میں میری ممتا اور عامر کی
[illegible] پی جانا چاہتا ہو۔ تنہائیاں 'ڈسپلن' اس کے
[illegible] تھا' صرف میں اور عامر نہیں تھے۔ وہ
میری بیماری کی وجہ سے ہراساں رہتا تھا۔ ایک دن
[illegible] دیر ہو جاتی تو وہ عامر کے موبائل پر مس کالز
[illegible] کر لاکٹ ہو جاتا پھر میں اور عامر اسے میسج
[illegible] کرنے لگتے اور ہر دفعہ وہ کہتا۔

"میں اس مہینے آرہا ہوں۔"

اس سے اگلے مہینے اور میں دروازے کے اندر
[illegible] انتظار اوک میں تھامے اس کی محبت' اس کی
[illegible] ذہین آنکھوں میں ذو حتی ابھرتی۔ کامرانی کی
[illegible] مجھے کو دم سامنے کھڑی رہتی۔ ہر کال بیل پر مجھے
[illegible] ہوتی۔

"[illegible] آگیا ہے' بالکل آج کی طرح۔"

یکدم میں نے عمیر کی طرف دیکھا پھر بے چارگی
سے بولی۔

"باہر ابھی کال بیل بجی تھی' عمیر کون تھا۔"

[illegible] کی وجہ سے میری یادداشت' میرے حواس بہت
کم ساتھ دیتے تھے' اس لیے میرے سوال پر عامر کے
لب ہلے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کہہ پاتے' عمیر
پلیٹ میں چمچ مار کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا پھر جھنجلا کر
پکارا۔

"باہر [illegible] بات
[illegible] سمجھ میں کیوں نہیں آتی مما۔"

عامر کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور میری آنکھوں میں
[illegible] کہاں سے اتنا ڈھیر سارا پانی آگیا۔ عامر' عمیر کو
سخت سست سنا رہے تھے اور میں گم صم بیٹھی تھی۔ کبھی
اس بچے کی سفید سلیٹ پر میں نے کتنی مشکل سے
لفظ لکھے تھے' زندگی سے تعارف کروایا تھا۔ اس کی
ڈکشن میں زندگی کی ہر پہلی چیز کو ایک معنی دیے مگر اس
ڈکشن میں اب ہر چیز کے معنی تھے' صرف میرا نام
متروک ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں اس پر جمی تھیں اور
ان میں بہت سارے سالوں میں سے ایک دن اور اس
جیسے بہت سارے دنوں کا شکوہ تیر رہا تھا مگر اس کی نظر
کسی پر نہیں تھی اور نہ ہو سے بعید اولاد کی نظر کسی پر کہاں
ہوتی ہے۔ آج گرل پر بیٹھا کالا کوا مجھے بہت یاد آیا تھا۔

ٹرن ٹرن... فون بیل پر میں اٹھی۔ عامر لفظ ڈھونڈ
رہے تھے جس سے وہ میری دلداری کر سکیں اور ریسیور
کے دوسری طرف میری بہت پرانی دوست پوچھ رہی
تھی۔

"جی میں عالیہ بات کر رہی ہوں' کیا نوید سے بات
ہو سکتی ہے؟"

"نوید!... سوری یہاں کوئی نوید نہیں رہتی۔"

آج مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ کچن میں ویسا ہی سناٹا تھا
جیسا ہماری زندگیوں میں آکر رک گیا تھا لیکن میں نے
پھر سے ایک معصوم چوری کی تھی۔ دعا کے لالچ میں!
مگر دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ شاید آج کل
کسی کے پاس کسی سے بات کرنے کے لیے وقت
نہیں تھا اور گرل پر بیٹھا وہ کالا کوا۔ میں ساکت و
صامت کھڑی تھی۔ جب عامر میرے قریب آن
رکے۔

"بھول گئیں بیوی! تمہیں اسی بات پر معافی ملی
تھی کہ تم خود کو کبھی نہیں بھولو گی۔ اور دیکھو کیا میں
آج تک خود کو بھولا ہوں۔"

انہوں نے کھینچ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور میری
آنکھوں کی جل تھل میں ان سے کہہ بھی نہیں سکی کہ
وہ گرل سے کالا کوا اڑا دیں' اس کی آواز بہت بری لگتی
ہے' کانوں میں چبھتی ہے۔ میں بالکل نہیں کہہ سکی۔

سعدیہ عزیز آفریدی

وقت اور زندگی

"میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے لگا۔ میں اسے آج سے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"

اس نے نظر موڑ کر اپنی کانفیڈنشل ڈائری کو دیکھا اور وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ یہ اس کا معمول تھا۔ وہ جب بھی دعا عمر سے کوئی راز شیئر کرنا چاہتا تو ایسے ہی لفظ لفظ سے داستان کی جنت کرتا اور دعا عمر ایسے ہی خاموش اس کے سامنے بیٹھی رہتی' جیسے وہ ایک بے جان ڈائری ہو' جس میں صرف لفظ اور جذبے قید ہوتے دل کی دھڑکن سنائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن جب بھی وہ دانل سعود کے پاس سے اٹھتی تو اسے لگتا دعا عمر کے بجائے صرف دل ہو' جو دھڑکے ہی جاتا ہو' یا صرف محبت کا مسنت کا دیا ہو' جو لو دے کر جلتے ہی جانے کو اپنا ایمان جانتا ہو۔ اور ایک ایسی زندگی تھی کہ اس دیے میں تیل کی طرح ٹپ ٹپ پگھلتی جارہی تھی اور اسے خبر ہی نہ ہوا۔

"تم نے میری بات سنی دعا! یار وہ بس دیکھنے اور دیکھتے ہی چلے جانے کی چیز ہے آپ اسے ایک بار نظر بھر کر دیکھیں تو لگتا ہے بس آپ وہیں رہ گئے ہیں اور جو واپس پلٹا ہے' وہ صرف سراب ہے' دھوکہ۔"

دعا عمر نے اپنے تراشیدہ بالوں کو زور سے ہلایا۔ اندر کے شور کو چپ کرا کر خاموشی کے سینے سے لفظوں کی نہر نکالی۔

"[illegible] سچائی [illegible] موت بھی کر پورا جھوٹ ہی کی تھی [illegible] کی پسند پر تشنے پاس کر رہی تھی جو اس کی پسند اور [illegible] تھی اور وہ تو بھی سچ کے پورے جھوٹ

ہوئی وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"مسلمان بنیاد پرست کے مفروضے پر کند آلے سے بار بار قتل کیے جا رہے ہیں اور ہم مسلمان سیکولر ہونے کے زعم میں اپنے مسلمان بھائیوں پر بم برسانے کے لیے اپنی زمینیں دیتے ہیں۔ اپنی توانائی اپنی خدمات دیتے تاکہ آج کی سپر پاور ہم پر مذہبی تعصب پسندی کا ٹھپہ لگا کر ہماری امداد نہ بند کروا دے۔"

اس کے سامنے سے یکدم وائل سعود غائب ہو گیا تھا وہ خود آ گئی تھی یا عمر ایک مسلمان گھر میں پیدا ہونے والی عام لڑکی جو جینز اور شرٹ پہن کر خود کو پر سکون محسوس کرتی تھی۔

"ہماری زندگی میں ہمارے مذہب کا صرف اتنا عمل دخل ہے کہ وہ ہمیں پہچان دیتا ہے۔"

"ہم نے قوم کو مٹی سے پیدا کیا پھر قبیلے اور گروہ بنائے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، اللہ نے ہمیں قبیلے اور گروہوں میں پیدا کیا تاکہ پہچانے جا سکیں اور پھر غرور باطل کیا کہ قوم کو مٹی سے بنایا تھا لیکن ہم انسانوں نے اپنے قبیلے اور گروہوں کی پہچان کو اعلیٰ نسبی ہم نسبی کی حیثیت سے پہچان دی اور ایک دوسرے کو رد کر دیا۔ اللہ نے کہا ہم نے نہیں مانا اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"کسی کالے کو کسی گورے پر، کسی گورے کو کسی کالے پر، کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ سوائے تقویٰ کے۔" لیکن یہاں رنگ، نسل، قوم پرستی میں تقویٰ کی کسوٹی کہیں دب گئی۔

آج نور کہتی ہے وہ مذہب کا زندگی میں اتنا عمل دخل سمجھتی ہے کہ مذہب انسان کو پہچان دیتا ہے۔ لیکن ہم میں سے کون اس پہچان پر پورا اترتا ہے۔

اس نے وائل سعود اور اپنے سیمنار کی طرف دیکھا اور پھر سعود کو بغیر کسی کام کے مصروف نظر آنے کی کوشش میں دیکھا اور سر جھٹکا ہے۔ ہم دنیا کو پوری طرح دیکھنے کی ہوس میں کہ ہم میں کچھ بھی تو

نہیں دیکھ پاتے۔ وہ گھر آ گئی تھی۔ آج پہلی بار اس نے شلوار قمیص پہنی تھی۔ وضو کیا تھا اور قرآن کا ترجمہ لے کر بیٹھی تھی۔ اس نے حافظہ نور السلام سے پردے کا حکم کس سورۃ میں ہے کے بارے میں پوچھا تھا۔ نور السلام اس کے زکی وقت میں کمپیوٹر پروگرام تھی۔ حجاب لیتی تھی۔ اور اس کے اس سوال پر حیران تھی پھر سنجیدگی سے بولی۔

"یہ حکم قرآن میں جگہ جگہ ہے قرآن میں نماز، زکوٰۃ، روزہ کی طرح اس کا حکم بھی بہت جگہ دیا گیا ہے۔ بہت واضح تمہیں سورۃ الاحزاب میں ملے گا۔"

سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ کا ترجمہ پڑھ رہی تھی۔

"اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے (موتھوں) پر چادر لٹکا کر (گھونگھٹ نکال) لیا کریں یہ امر ان کے لیے موجب شناخت (امتیاز) ہو گا تو کوئی ان کو ایذا نہ دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

اس کے اندر ابال آ گیا تھا۔ آنکھوں کی نمی رخساروں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ کہیں قریب ہی دوسرا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا جب پردے کے بارے میں اس کے ہمراہ بیٹھی کوئیک عاصمہ اپنی سوچ بیان کر رہی تھی۔

"حجاب آنکھ کا ہو تو پھر بھی پردہ ہے ضروری نہیں ہم حجاب لیں۔" وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور نور السلام نے اس کے جواب میں ایک آیت پڑھ کر سنائی تھی یہ بھی سورۃ الاحزاب ہی کی چھتیسویں آیت تھی۔

"اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہ ہو گیا۔"

اس نے یہ آیت پھر سے پڑھی تھی اور کانپ گئی تھی کہ وہ آج تک کتنی بڑی بھول میں رہی تھی۔

کرنے لگا تو یہ فرق اور کھل کر اس کے سامنے آگیا۔
وہ آئے نور سے اب ہفتوں نہیں ملتا۔ وہ کھٹکتی ہی نئی دوستیاں کرتی لیکن غیر مطمئن سی یہاں تک کہ وہ ایک دن پھٹ پڑی۔
"تم دراصل مسعود! تم بھی وہی عام مرد نکلے عام مسلمان متعصب پسند مسلمان۔"
"مسلمان تو تم بھی ہو آئے نور۔" اس نے اسے بیچ میں ٹوک دیا اور وہ بھنائی۔
"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ وہ میرا ماضی تھا اور میں حال میں جینا چاہتی ہوں۔"
"لیکن میرا ماضی میرے حال اور مستقبل سے جدا نہیں ہے۔ تم کہتی ہو تم میرے لیے اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتیں۔ جو تمہارا مذہب بھی نہیں ہے لیکن آج میں کہتا ہوں میں اپنے مذہب کے لیے تمہیں چھوڑ سکتا ہوں اور آج اسی طرح تمہیں چھوڑنے کا میرے دل کو کوئی ملال بھی نہیں ہے۔" آئے نور حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتی رہی، آج اس کی خوبصورتی، اس کی ڈریسنگ کسی چیز نے بھی اسے متاثر نہیں کیا تھا۔

وہ رخ موڑ دیکا تھا یہ اس کے چلے جانے کا اشارہ تھا وہ تلملائی ہوئی اٹھی تھی اور اس ہوٹل سے نکل چلی گئی تھی۔ پھر شام کو وہ اماں کے سامنے بیٹھا تھا۔
"مجھے ایک عرصے تک ظاہر نے مسحور کیا اماں! اب مجھے لگتا ہے، جیون ساتھی خوبصورت نہ بھی ہو لیکن آپ سے سچی محبت کرنے، آپ کی پروا کرنے والا ہو تو آپ نے دنیا ہی میں بہت کچھ پالیا ہے۔" اماں اس کی بات سمجھ گئی تھیں۔ اسی لیے وہ اس کی تمنا پر دیا عمر سے ملنے دیا عمر کو مانگنے جا پہنچی تھیں۔ اس نے سنا تو رونے لگی تھی۔ اس نے بیٹے کے لیے صرف اپنی تمنا کا پیچھا کیا تھا اس لیے ناکام رہی تھی لیکن جب سے اس نے اللہ کی رسی کو تھاما تھا، جو انعام خود اس کا راستہ ڈھونڈتے [illegible] ہوئے آیا تھا۔

اس نے محبت کو پانے سے انکار نہیں کیا تھا۔ اماں خوش خوش لوٹی تھیں۔ انہیں دیا عمر بہت پسند آئی تھی لیکن ثانیہ حیران تھی۔
"آئے نور کو چھوڑ کر یہ دیا عمر کیسے بھایا۔"
وہ اسے سامنے بٹھا کر سنجیدگی سے بولا۔
"ایک عمر ہوتی ہے اسٹیچورڈ جس میں ہر چمکنے والی چیز سونا لگتی ہے۔ ظاہری خوبصورتی دل بھاتی ہے لیکن ایک عمر آتی ہے جب انسان زندگی کو سنجیدگی سے لیتا ہے اور سوچتا ہے زندگی صرف خوبصورتی سے نہیں گزاری جاتی اس کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہے پروا اور محبت کا ہونا ضروری ہے اور یہ سب باتیں دیا عمر میں ملتی ہیں۔"
ثانیہ نے سر ہلا کر اس کی بات سمجھ جانے کی تصدیق کی۔

دوسرے دن دفتر کے بعد وہ اس کے دفتر چلا گیا تھا۔ وہ کام ختم کرکے اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ بالکل خاموش۔ اس نے گلا کھنکار کے اماں کی آمد کا پوچھا اور اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ چہرہ تو حجاب میں چھپا ہوا تھا وہ خوش تھی بہت خوش۔
اور وہ گنگنایا تھا۔

عجب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

وہ رکا پھر بولا۔
"لیکن مجھے خوشی ہے میں نے اس بیتنے والے وقت میں کچھ نہیں کھویا۔ ایک اچھا دوست بنایا تھا اس ہی اچھے دوست کو شریک زندگی بنا رہا ہوں۔ میرا وقت برا نہیں گزرے گا۔"
اس نے نظر جھکالی اور محبت اس کی شریر نگاہوں سے دھڑکن کا پردہ سرکا تو جیسے اسے تک رہی تھی۔ سامنے بیٹھا شخص ظاہر پر مرتا تھا لیکن محبت نے اسے بھی تیر کی طرح سیدھا کردیا تھا۔ دھڑکن دھڑکن کا حجاب ہٹا کر اسے باطن میں جھانکنے کی تربیت دی تھی۔
سو دونوں نے محبت کی عنایت دیکھ کر آدھا آدھا سفر بانٹ لیا تھا۔ اور اس محبت پر، اس کی کٹھنائیوں پر دونوں میں سے کسی کو اعتراض نہیں تھا۔
دونوں کے پاس خوبصورت خواب اتنے تھے اور محبت کو یہی زاد راہ کافی تھا۔

★

اور پھر یہ اس کی ماما کی بہت پرانی عادت تھی کہ وہ سارے گھر کو تو چمکا کر رکھتیں مگر خود پر ذرا سی بھی توجہ دینے کی کوشش نہ کرتیں۔ ہمیشہ ان کے پیروں میں چکر رہتے۔ وہ ادھر بھاگتیں ادھر دوڑتیں۔ پاپا کو انہوں نے نہایت آرام طلب بنا دیا تھا۔ اتنا آرام طلب کہ وہ کچن میں ہوتیں تب بھی پاپا سامنے پڑے جگ سے پانی نکال کر پینے کی بجائے آواز دیتے۔

"بیٹا پلیز! ایک گلاس پانی پلا دو۔" اور ماما اپنا ہر کام چھوڑ کر فریج سے پانی لیے ان کے سامنے جن کی طرح آموجود ہوتیں۔ چولہے کے سامنے کھڑے کھڑے ان کا چہرہ لال بھبوکا ہوتا مگر ان کے چہرے پہ پھر بھی حلاوت سی چھائی رہتی۔ ایک شکن تک نہ پیدا ہوتی اور وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر ان کی چکر پھیری کو تکتا رہتا۔ مزاج تو ماما نے اس کا بھی شاہانہ بنا دیا تھا مگر وہ زیادہ سے زیادہ ماما کا خیال رکھتا۔ اچھے بچوں کی طرح اسکول سے آکر بیگ جگہ پر رکھتا۔ یونیفارم خود اتارتا۔ ہوم ورک خود کرتا۔ ماسوائے ان باتوں یا سوالوں کے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتے، وہ ماما سے رجوع ہوتا۔ اپنا رومال اور موزے ماما سے چھپ کر وہ خود ہی دھوتا۔ ماما خفا ہوتیں تو گلے میں بانہیں ڈال کر کہتا۔

"ماما آپ ہر سارا کام کرتی ہیں تب ہی میرا۔ کیا ہوا جو میں نے چھوٹے چھوٹے کام کرنے میں آپ کی مدد کر دی [illegible]"

لیکن ماما ایسی باتوں کے لیے تنبیہ کرتیں کہ بیمار پڑ جاؤ گے پانی میں بھیگ کر۔ اور وہ [illegible] دنوں میں، جون جولائی کی گرمیوں میں ماما کو کپڑے دھوتا دیکھتا۔ ماما کو پانی میں شرابور دیکھتا تو بدحواس ہو جاتا کہ اگر جو ماما بیمار پڑ گئیں تو؟

پاپا کہتے۔ "تھکا" نہیں تمہاری ماما بڑی طاقت ور اور بہادر ہیں۔ یہ بیمار پڑ ہی نہیں سکتیں۔" یہ سن کر ماما کے چہرے پہ سرخی دوڑ جاتی اور ماما کی فرینڈز کہتیں۔

"ثنا! تم نے تو خود کو تباہ کر لیا۔ کتنی پیاری اور خوب صورت ہوا کرتی تھیں، کچھ ہی برس میں کتنا بدل گئی ہو۔"

ماما مسکرا کر ایک ایک ڈش اپنی فرینڈز کی طرف بڑھاتے جاتیں۔ جب سوال بہت بڑھ جاتے تو کہتیں۔ "میں کیا کروں یار! مجھے بس کام کرتے رہنے میں سکون ملتا ہے۔ تم جانتی ہو ناں میں بچپن سے ہی کام کی عادی ہوں۔"

"ہاں! اسی لیے تو سوچتے تھے ہم کہ اتنا اچھا شوہر ملنے پر شاید تم اور تمہاری عادتیں بدل جائیں۔ ممانی جان کی سختی، ترشی اور زیادتی سے چھٹکارا ملتے ہی تم بھی ہل کر پانی بھی نہ پیو گی مگر تم نے تو الٹا ہی آکر سمعان حسن کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ اتنا ایکٹو بندہ تھا۔ اب تمہارے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا۔"

اور دوسری کہتی۔ "ثنا جتنی سیدھی ہے، اتنی ہی گھنی ہے۔ خوب اس عادت سے شوہر کو قابو کیا ہے۔ اب کہیں اور جانے سے پہلے، دیکھنے سے پہلے سو سو بار غور کرے گا کہ اتنی سہولیات اور آرام کیا کوئی اور دے سکے گی اور جواب ہمیشہ صفر ہی ہوگا اسے۔"

"یہ ہے تو بس پوائنٹ مگر یار! جب شوہر کی نظر اور دل بدل جائے تو آپ کی کوئی اچھائی کام نہیں آتی اور میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ میری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔"

اور ایسے میں خوشی ان کے چہرے کی ایک ایک
جگنو کی طرح چمکتی پھرتی۔ وہ ان کے چہرے پر
سے لطف لے رہا تھا۔ تقریب اب اپنے
اختتام کی طرف ایک وقت آیا وہ اختتام پذیر بھی ہو گئی
اور پھر پریشان ہو گیا۔

یا وہ بھی اس کی ماما ہو سکتی تھیں، غیر اہم و بین کی وہ آخر
کی ماما ہوتی ہیں، ہر پردہ کیوں رہتی ہیں؟ ساری زندگی بھی
جیتی رہتی ہیں اور لوگ پھر بھی ان کی محنت کو کسی سو کی
کامیابی میں حاصل ضرب نہیں کرتے۔ ان کی کامیابی کو
ان کا حق سمجھتے ہیں۔ آخر کیوں؟

اس نے نگاہ اسکول کی عمارت سے نکلتے ہوئے ایک بار
ماما کے چہرے کی طرف نگاہ کی پھر ماما کے ہمراہ اسکول کے
احاطہ سے پرُ بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔
اس نے کہا۔ "تم اچھا رزلٹ لاؤ تاکہ ہم بن جاؤ کہ ماما خود
بخود تمہارے لیے اہم ہو جائیں۔"
عمران نے کہا "اس میں تو بہت وقت لگ جائے گا۔
ماما بوڑھی ہو جائیں گی پھر بھلا وہ کیونکر اب کی طرح
سلیبریٹ کریں گی۔ اب کی طرح جب وہ جوان ہیں
تب بھی انہیں کوئی بھی کام اور بات اہم نہیں لگتی ہے
سوائے میرے اور پاپا کے۔"
وہ باغ گھومتے جا رہا تھا کہ اچانک اس نے ہاتھ میں پکڑی
ہوئی کرکٹ بال سامنے سے آتی ہوئی نجم انکل کی کار کی
طرف اچھال دی۔ یہ قطعاً غیر اختیاری حرکت تھی مگر
نجم کار کے سامنے آجانا اس کے دماغ میں آجانے والے
اس کی کارستانی تھی۔ اسکول کی بچے بچیوں کی مائیں سب
ادھر ہی تھے سو ماما کے "ہائے میرا بچہ" چلانے اور نجم
انکل کی کار کے بریک چرچرانے پر سب ساکت ہو گئے
تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب کا جمگھٹا اس کے گرد جمع
ہو گیا۔ گاڑی سے اس کے یونیفارم کوٹ کو نوچ لگا تھا اور وہ
زمین پر جا گرا تھا۔
UrduPhoto.com
تو بچ گئی جان۔ تیزی سے اس کی طرف لپکی
تھیں۔ نجم انکل بھی تیزی سے نکلے تھے۔
"کیا ہوا بیٹے؟ چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟" سب کے
سب اسے وی آئی پی لے رہے تھے اور وہ دل ہی دل میں
مسکرا رہا تھا۔ کون نہیں جانتا۔ نجم انکل کی گاڑی تھی سو

چلتی ہے اور کس قدر رک رک کر آگے بڑھتی ہے اگر
حقیقت میں بھی یہ ایکسیڈنٹ ہوا ہوتا تو صرف کر دی
جزوقتی تھی مگر اس وقت اسے اس خیال کو ہی ترد کرنا تھا۔
سو فوراً "رونے لگا۔
ماما اور نجم انکل بدحواس ہو گئے۔
"بہت چوٹ لگی ہے میرے بچے؟" ماما نے کھینچ کر
سینے سے لگایا اور کئی نہیں سب نے یہی پوچھا۔
"آپ ان کی کون ہیں محترمہ؟"
"یہ میری ماما ہیں۔ آپ کو اتنا بھی پتا نہیں چلا؟"
تکلیف کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اس نے اتنی معصومیت
سے سوال کر ڈالا کہ سب مسکرا دیے۔
مس عاصمہ جو اب تو خوش بیوٹی کوئن کہلاتی تھیں
ان کا گال تھپتھپا کر مسکرائی تھیں۔
"کیوٹ چائلڈ سا در ہوا کرتے ہیں۔"

"یس مس ایکن میری ماما مجھ سے زیادہ کیوٹ ہیں۔"
"او شیور! واقعی آپ کی ماما بہت کیوٹ ہیں۔"
سب خواتین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ماما اس
کے کوٹ سے گرد جھاڑ رہی تھیں۔ ان کی چپل گئی تھی
گھٹنے سے پینٹ مسک گئی تھی، چہرہ خراشیں گھٹنے پر بھی آئی
تھیں لیکن ماما اس طرح سب کے درمیان وی آئی پی بنی
کھڑی تھیں کہ اسے یہ تکلیف محسوس ہی نہ ہوئی۔ سب
اسے پیار کرنے کے ساتھ ساتھ ماما سے ہاتھ ملاتے ہوئے
ان کی تعریف کر رہی تھیں۔
اور وہ ماما کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور کانوں میں مس
عاصمہ کے جملے کی بازگشت تھی۔
"او شیور! واقعی آپ کی ماما بہت کیوٹ ہیں۔"
ماما کے چہرے پر تھکن میں ملی جلی پریشانی میں اس کے
لیے محبت ' اتنا لاثانی تاثر رکھتی تھی کہ سب کچھ پس منظر
میں چلا گیا تھا اور ماما تھیں پوچھ رہی تھیں۔
"تم کیسے ہو بیٹے؟"
"آئی ایم فائن ماما۔" اس نے مسکرا کر ماما کا ہاتھ چوم
لیا اور زندگی اس کی ایک مسکراہٹ میں ڈھلی آگے بڑھ گئی
اور محبت اسے رعنائی ہوئی اور وہ حقیقت میں اس کا راز
دار تھا۔

❋